Scanned by CamScanner

تمام کتابیں بغیر کسی مالی فائدے کے پی ڈی ایف کی جاتی ہیں ۔

مصنف کے خیالات سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں ۔

فیس بک گروپ

کتابیں پڑھئے

ایڈمن ۔ سید حسین احسن

0344-818-3736

0314-595-1212

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

سلسلہ مطبوعات اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (۱)

سن اشاعت

۱۹۸۵ء

تعداد

۵۰۰

قیمت فی جلد

۲۰ روپے

ملنے کا پتہ

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ روشن [illegible] بدایوں

مطبوعہ۔ ------

کتابت ------------ اختر حسین اختر بدایونی

Scanned by CamScanner

شمس بدایونی

کے نام

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل!

Scanned by CamScanner

ترتیب

Scanned by CamScanner

ابتدائیہ

راقم الحروف نے ۱۹۵۳ء سے مضامین لکھنے کا آغاز کیا۔ اب تک تقریباً ایک ہزار مضامین سپردِ قلم کر چکا ہوں۔ جناب شمس بدایونی کے اصرار پر صرف نیا دور (لکھنؤ) میں جو مضامین مختلف شخصیات پر شائع ہوئے اُنہیں ترتیب دے دیے۔ اگر اربابِ ادب نے ان مضامین کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تو دیگر منتشر مضامین کو بھی کتابی شکل میں یکجا کرنے کی کوشش کرونگا

سید علی جواد زیدی اور شمس بدایونی کی محبت و خلوص کا ممنون ہوں جو مجھے ان مضامین کی ترتیب و اشاعت پر اُکساتے رہے۔ اور بالآخر یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ویریندر پرشاد سکسینہ

Scanned by CamScanner

پیش لفظ

ویریندر پرشاد سکسینہ جیسے دھن کے پکے بات کے سچے لوگ ادب کی دنیا میں شاذ ہی ملیں گے۔ میں انھیں پہلے "زمانہ" (کانپور) کے شماروں میں پڑھا کرتا تھا۔ اور ان کے اس شوق اور لگن سے واقف تھا کہ جو لوگ یاد رکھنے کے لائق ہیں انہیں آسانی سے بھلایا نہ جائے۔ اس کے لئے وہ ڈھونڈ کے مواد فراہم کرتے اور ادب نوازوں تک پہنچاتے رہتے تھے۔ جس زمانے میں "اطلاعات" لکھنؤ اور اس کے جانشین "نیا دور" کی ادارت سے میرا بھی علاقہ قائم ہوا تو میں نے انہیں "زمانہ" کے روحانی تعلق سے یاد کیا اور پھر ان رسالوں میں وہ لکھنے لگے۔ "نیا دور" میں یہ سلسلہ اب بھی قائم ہے۔ جب اتر پردیش اردو اکادمی کے جریدۂ "اکادمی" کی زمامِ ادارت میں نے سنبھالی تو مجھے ان کی پھر یاد آئی۔ اور وہ اب "اکادمی" کے قلمی معاونین میں بھی شامل ہیں۔ کئی دہائیوں کے اس تعلق کے پیشِ نظر اس مجموعۂ مضامین کے لئے چند تعارفی سطریں لکھنے کی فرمائش کو ٹالنا میرے لئے ناممکن ہوگیا۔ اگرچہ آج کل کاموں کا بیحد ہجوم ہے۔ میری کئی تصانیف بیک وقت تکمیل یا طباعت کی آخری منزلوں سے گزر رہی ہیں۔ پھر کچھ مکروہاتِ زمانہ بھی ہیں جن سے تاحیات چھٹکارا نہیں ملتا، لیکن ان سب کے باوجود میں نے بخوشی اس فریضے کی ادائیگی کو منظور کر لیا۔ اور کچھ بکھرے ہوئے خیالات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

ویریندر پرشاد کا تعلق علم و ادب کے اہم مرکز بدایوں سے ہے۔ اس نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ اور آج بھی ویریندر پرشاد سکسینہ اور شمس بدایونی جیسی ہستیاں اس شہر میں ہیں جسے بے رحم زمانے نے بہت کچھ لوٹ لیا ہے۔ اردو ادب کی شمعیں روشن

Scanned by CamScanner

لکھے ہیں۔ دونوں کے نام ایک ساتھ اس لئے لے رہا ہوں کہ یہ دونوں بزرگوں کی یادیں محفوظ کرنے کے نیک کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اور آئندہ کے مورخ ادب کے لئے خام مواد مہیا کرتے جا رہے ہیں۔

سکینہ طبعاً کچھ لا اُبالی واقع ہوئے ہیں۔ اِدھر اُدھر رسالوں میں تو بیسیوں مضامین لکھ ڈالے ہوں گے۔ لیکن ابھی تک کتابی صورت میں کچھ بھی شائع نہیں کیا ہے۔ اگر ایسے مضامین کی شیرازہ بندی نہ کی جائے تو یہ کبھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اس مواد کا یکجا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذاتی تجربہ یہ ہے کہ خود میرے کئی مضامین کی نقلیں مجھ سے عاریتہً مانگی گئیں اور پھر واپس نہ آئیں اب ڈھونڈتا ہوں تو اُن کا کہیں سُراغ نہیں ملتا۔ اسی لئے میں نے دیرینہ صاحب سے بار ہا اصرار کیا کہ وہ اپنے مضامین کو یکجا کر دیں تاکہ دستبردِ حوادث سے محفوظ ہو جائیں۔ مجھے مسرت ہے کہ اُنہوں نے یہ بات مان لی اور اُن کے مطبوعہ ذخیرے کی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے۔

اس میں نو اہم ادیبوں اور شاعروں کے حالات یکجا کئے گئے ہیں۔ ان میں چکبست اور شوق کے علاوہ دوسروں کے بارے میں علی العموم مواد نہیں ملتا۔ ان دونوں حضرات کے بارے میں بھی سکینہ نے گوشے ڈھونڈ نکالے ہیں ان کے علاوہ کرشن سہائے وحشی، رام بابو سکینہ، دیا نرائن نگم، بنواری لال شعلہ، جوالا پرشاد برق، اندرجیت شرما اور جگت موہن لال رواں، سبھی اہم ادبی شخصیتیں ہیں۔ اور اپنے حلقہ ہائے کار میں اُنھوں نے نام پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کے بارے میں کم لکھا گیا ہے۔ نگم صدی سے پہلے اُن پر بھی کچھ نہیں ملتا تھا۔ موجودہ کام سکینہ ہی کر سکتے تھے۔ مضامین کے مطالعے کے بعد ہی اُن کی تلاش دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کا صحیح اندازہ لگ پائے گا۔ تحقیق کے ساتھ وہ تنقیدی نظر بھی رکھتے ہیں اور دونوں کے صحیح مقام سے واقف ہیں۔ اندازِ بیان میں کوئی ژولیدگی اور استدلال میں کوئی پیچیدگی آنے نہیں دیتے۔ سادگی و پرکاری اُن کے ہر مضمون کا نمایاں پہلو ہے۔ وہ تنقیدی نظریات کی بحثیں نہیں اُٹھاتے۔ معانی و بیان سے خصوصی موشگافیاں نہیں کرتے ہیں۔ وہ ادب پاروں کا تجزیہ

Scanned by CamScanner

کرتے وقت ایک ذی ہوش قاری کی طرح اپنے تاثرات میں عام قاری کو شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے انہوں نے عمومی سطح کی ایک لکیر مقرر کر رکھی ہے۔ اس خط کو وہ شاذ ہی پار کرتے ہیں۔ یہ توازن اور یہ آہستہ روی انہیں ہمیشہ قاری کا ہم نشین بنائے رکھتی ہے اور یہ لطفِ ہم نشینی اُن کی تعارفی تنقیدوں کی خصوصیت ہے۔ انھوں نے ہر مضمون میں مواد اور صاحب مضمون یعنی فن کار دونوں کا حق ادا کیا ہے۔ اور اُن کی ادبی کاوشوں کے تمام گوشے اُجاگر کر دیے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ دیریندر پرشاد سکسینہ صاحب کا یہ مجموعہ ضرور قبولِ عام کی سند پائے گا۔ اور ادب اردو کی تدوین کرنے والوں کے کام آتا رہے گا۔ اس مجموعہ کی ترتیب پر سکسینہ صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اور ہم یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ بقیہ مضامین کی ترتیب و تدوین بھی جلد کر ڈالیں گے

سیّد علی جواد زیدی

۳/۶ ۔ ڈالی باغ کالونی ۔ لکھنؤ

بنواری لال شعلہ

ہندوں نے اُردو ادب کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اُس کا سلسلہ اردو کے جنم دن سے آج تک چلا آ رہا ہے۔ کالستھوں کو اس سلسلہ میں خاص امتیاز حاصل رہا ہے۔ اور منشی جوالا پرشاد برقؔ، نوبت رائے نظرؔ، دوارکا پرشاد افقؔ، ہر گوپال تفتہؔ اور بالمکند بے صبرؔ کے نام ادبی تاریخ کا روشن نشان بن گئے ہیں۔ اس مقالے میں ایک ایسے اُردو شاعر بنواری لال شعلہؔ کا ذکر کیا جا رہا ہے جنھوں نے کرشن بھگتی اور رام بھگتی پر اردو میں ایسی بلند پایہ نظمیں کہی ہیں جن کا جواب ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں میں مشکل سے ہی مل سکے گا۔

بنواری لال شعلہؔ کے بزرگوں کا وطن حصار صوبہ پنجاب تھا اور اُن کے یہاں قانون گوئی کا عہدہ وراثتاً چلا آتا تھا۔ اُن کا تمام خاندان علم دوست تھا۔ اُن میں بعض اہلِ تصنیف بھی گزرے ہیں۔ بنواری لال شعلہؔ کی ولادت ۵؍ جولائی ۱۸۴۱ء کو بمقام سہارن پور ہوئی۔ وہاں اُن کے والد منشی موتی لال محکمۂ کلکٹری میں صدر ناظر کے عہدے پر فائز تھے۔ عشرتؔ لکھنوی تذکرہ "ہندو شعراء" میں صفحہ ۱۳۷ پر رقمطراز ہیں۔ کہ بنواری لال شعلہ بریلی کے رہنے والے تھے جو صحیح نہیں ہے۔ برقؔ سیتاپوری نے تذکرہ "بہارِ سخن" میں اُن کا سالِ ولادت ۱۸۴۵ء تحریر کیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ شعلہ صاحب کے حقیقی بھتیجہ کا ایک مقالہ بنواری لال شعلہ کے سلسلے میں کالستھ سماچار جنوری ۴؍ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اُنہوں نے شعلہ صاحب

Scanned by CamScanner

کی تاریخِ ولادت ۲۵ جولائی ۱۸۴۷ء تحریر کی ہے اور یہی صحیح تاریخ ولادت ہے شعلہ کا بچپن، جوانی اور پیری کا زمانہ علی گڑھ میں گزرا۔ اسی نسبت سے وہ شعلہ علی گڑھی کہلاتے ہیں۔

اوائلِ عمری میں شعلہ کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس لئے اُن کی تعلیم مکتب سے آگے نہ بڑھ سکی۔ انتظامِ خانہ داری اور معیشت کی فکریں دامن گیر ہوگئیں۔ آخر ۱۸۷۳ء میں دفتر بندوبست علی گڑھ میں ملازم ہو گئے۔ لیکن ملازمت کی پابندیوں کو طبیعت سے مناسبت نہ تھی۔ اس لئے اس کو خیر باد کہہ دیا اور وکالت کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ ہی میں وکالت شروع کر دی۔ ابتدا میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن آخر زمانے میں اُن کا شمار علی گڑھ کے ممتاز وکیلوں میں ہونے لگا تھا۔ جب صاحبِ مال ہوگئے تو محلہ جے گنج علی گڑھ میں ایک مکان بنوالیا۔ اور اُس مکان کے سامنے ہی ۱۸۹۹ء میں ایک مندر تعمیر کرایا۔ شعلہ کرشن بھگت تھے۔ لیکن اُنھوں نے اس مندر میں شری گوپیشور ناتھ مہادیو جی کی مورتی کی استھاپنا کرائی تھی۔ عین رام نومی کے دن ۱۹۰۳ء میں دس بجے دن کو دردِ نقرش میں انتقال فرمایا۔ اولاد میں کوئی لڑکا نہ تھا۔ ایک لڑکی تھی جو کرشن گوپال ورما بی۔ اے۔ رئیسِ علی گڑھ کو منسوب تھی۔ اس کا انتقال بھی شعلہ کی وفات کے تین سال بعد ہو گیا۔ شعلہ کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا اور اُن شاگردوں میں منشی کندن لال شرر سہارنپوری خاصے معروف ہیں جو شرر سہارنپوری نے اپنے اُستاد کے مرنے کے بعد اُن کی یاد میں اُنہیں کے نام پر ایک رسالہ شعلہ بھی جنوری ۱۹۰۴ء میں سیل گڑھ ریاست گوالیار سے نکالا تھا۔ اس رسالے کے شروع کے تین شمارے میری لائبریری میں محفوظ ہیں

شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے ہی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا۔ چونکہ اُن کے آباؤ اجداد شرابِ سخن کے دیرینہ متوالے تھے۔ باقاعدہ شاعری شروع کرنے کے بعد ابتدا میں منشی بال مکند بے صبر (شاگرد غالب) کو اپنا کلام دکھایا۔ لیکن کبھی کبھی مرزا غالب کے مایۂ ناز شاگرد حضرت تفتہ سے بھی مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ضیغم حیدر آبادی، دیا نرائن نگم، طالب دہلوی اور مولانا

Scanned by CamScanner

حسرت موہانی نے شعلہ کو دھوکے سے غالب کے شاگردوں میں شمار کرلیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ شعلہ مرزا غالب کے نہیں بلکہ اُن کے شاگرد تفتہ اور بے صبر کے شاگرد تھے۔

شعلہ کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ منشی امیر اللہ تسلیم ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ تشریف لائے۔ اُن کی آمد پر علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرہ کی اطلاع شعلہ کو مشاعرہ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے دی گئی تھی۔ شعلہ صاحب مشاعرہ میں گئے۔ لیکن اُنھوں نے غزل نہیں پڑھی۔ بعد اختتام مشاعرہ حضرت تسلیم سے ملاقات کی اور فرمایا کہ آپ ایسے صاحبِ کمال علی گڑھ تشریف لائیں اور شہر کے اہلِ ذوق و ادب اس سے محروم رہیں۔ اس لئے شہر میں بھی کل ایک بزم مشاعرہ منعقد کردی گئی ہے۔ دوسرے دن تسلیم نے مشاعرہ میں جس وقت شعلہ صاحب کی غزل سُنی تو بے اختیار ہو کر فرمایا آپ ایسے باکمال اور ایسے پوشیدہ۔

اُردو اور ہندی کے بعض نقادوں اور ادیبوں کا یہ خیال غلط ہے کہ شعلہ کا دیوان اب بالکل نایاب ہو چکا ہے اور صرف کچھ غزلیں اور کچھ اشعار محفوظ رہ گئے ہیں۔ شعلہ صاحب کا دیوان اور اُن کی حسب ذیل دوسری تصانیف میرے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

(۱) کلیاتِ شعلہ (طبع اول) یہ منشی بنواری لال شعلہ کے کلام کا مجموعہ ہے جسے منشی کرشن گوپال ورما بی۔ اے رئیس علی گڑھ نے مرتب کر کے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۴ء میں شائع کرایا تھا۔ اس مجموعے میں شعلہ مرحوم کا ہر صنف میں کلام موجود ہے۔ اور سارا کلام شاعرانہ محاسن سے آراستہ ہے۔ اس مجموعے کی ضخامت دو سو صفحات سے زیادہ ہے۔ اس اڈیشن میں ایک کمی بری طرح کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں حضرت شعلہ کے سوانحی حالات تمہید کے طور پر بھی نہیں ملتے۔ اس مجموعے کی قیمت ڈیڑھ روپیہ تھی۔ اور اس کے پبلشر بھی منشی کرشن گوپال ورما ہی تھے۔

(۲) کلیاتِ شعلہ (طبع دوم) اس دوسرے اڈیشن کے مرتب بھی منشی

کرشن گوپال ورما ہیں۔ پہلے اڈیشن میں کتاب دو حصّوں میں تقسیم تھی۔ لیکن طبع دوم میں بجائے دو کے تین حصوں میں منقسم کی گئی ہے۔ پہلے حصّہ میں مذہبی نظمیں ہیں۔ اور دوسرے حصہ میں غزلیات اور متفرق نظمیں ہیں۔ تیسرے حصّہ میں قومی نظمیں ہیں۔ اس اڈیشن میں شعلہ مرحوم کی سوانح عمری بھی منشی کرشن گوپال ورما نے لکھ کر شامل کردی ہے اور شعلہ صاحب کا فوٹو بھی کتاب میں شامل ہے۔ دوسرا اڈیشن ۱۹۲۴ء میں انصاری پریس علی گڑھ سے باہتمام محمد ذوالفقار الدین انصاری شائع ہوا تھا

(۳) بزمِ بندرابن:۔ اس کتاب میں شعلہ کے وہ شاعرانہ نغمے ہیں جو انھوں نے مرلی والے کی بھگتی میں میرا بائی اور سورداس کے رنگ میں لکھے ہیں۔ اس میں گوپیوں کے ہجر و غم، راس منڈل کی دلفریبیوں اور بنسی کی شیریں نوائیوں کے تذکرے ہیں۔ جن کو پڑھ کر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ بزم بندرابن میں مثنوی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں کرشن بھگت اس مثنوی کا پاٹھ صبح اور شام مندروں اور گھروں میں کرتے ہیں۔ بزم بندرابن کے اردو اور ہندی میں پندرہ اڈیشن میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس کتاب کے سلسلے میں طالب دہلوی منظوماتِ شعلہ پر مقالہ لکھتے ہوئے رسالہ آج کل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۳ء کے شمارے میں رقمطراز ہیں

> "بزم بندرابن نے تو شعلہ کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اردو داں سناتن دھرمی ہندو تو رامائن اور گیتا کی طرح اسے متبرک سمجھ کر اس کا روزانہ پاٹھ کرتے ہیں۔ بعض کا یہاں تک عقیدہ ہے کہ تہجی کے سدا چرتر کی طرح شعلہ کی بزم بندرابن بھی انسان کو دنیوی اور دینی اسباب راحت فراہم کرنے میں بہت ممد و معاون ہوتی ہے۔"

(۴) شری کرشن استتی:۔ اس میں شعلہ مرحوم کی کرشن بھگتی کے سلسلے میں وہ شاہکار نظمیں شامل ہیں جن کا پاٹھ صبح کے وقت اب بھی عقیدت سے سیکڑوں کرشن بھگت کرتے ہیں۔ کرشن استتی کے پچاس سے زیادہ اڈیشن اردو اور ہندی میں اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ کئی سال ہوئے اس کا ایک ہندی اڈیشن علی گڑھ کے ایک ن بھگت نے راگھوب پرنٹنگ پریس علی گڑھ سے شائع کرایا تھا۔ اس میں دو شبد

کے عنوان سے یہ لکھا ہوا ہے:

"اُن کی کرشن استتی آج بھارت کے ہزاروں آدمیوں کو کنٹھ (زبانی یاد) ہے۔ اور پربھات کی پوڑیہ ([illegible]) بیلا میں سیکڑوں گھر اس کے دھیان سے گونج اُٹھتے ہیں۔"

(۵) جناشٹ نندنی:۔ یہ شعلہ مرحوم کا وہ قابلِ ذکر مسدس ہے جس میں انہوں نے مریادہ پرشوتم بھگوان رام چندر جی کو گلہائے عقیدت پیش کئے ہیں۔ یہ مسدس کئی بار اردو اور ہندی میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے دو اُردو اڈیشن میری لائبریری میں محفوظ ہیں۔ میرے خیال میں چکبست کا "رامائن کا ایک سین" اس مسدس کے مقابلے میں کوئی ادبی حیثیت نہیں رکھتا۔

اردو کے بعض ادیبوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اُردو میں رامائن اور مہابھارت کی داستانیں تبرک کے طور پر ملتی ہیں۔ اگر اردو کے منظوم لٹریچر کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے تو صرف رامائن اور مہابھارت کی داستانوں پر مشتمل پانچ پانچ ہزار صفحات کے دو انتخابات شائع کئے جا سکتے ہیں۔ اور اس انتخاب میں شعلہ علی گڑھی کی منظومات کو ممتاز مقام حاصل رہے گا۔ کرشن بھگتی کے سلسلے میں نظمیں کہنے والوں میں گور سہائے ملتجی، نظیر اکبرآبادی، فرحت لکھنوی، خوشتر لکھنوی، برق دہلوی، سرور جہاں آبادی کا خاص مرتبہ ہے لیکن جو مقبولیت شعلہ کو حاصل ہوئی وہ اور کسی کو نہیں ہوئی۔ جگر بریلوی یادِ رفتگاں میں شعلہ کی کرشن بھگتی کی نظموں کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

ہندوؤں میں آپ کے کلام کو خاص مقبولیت حاصل ہے اس کا راز آپ کے وہ شاعرانہ نغمے ہیں جو آپ نے اقلیم حسن کے تاجدار مرلی والے کی شان میں گائے ہیں۔ ایک دیوان غزلوں کا بھی ہے جس میں کم و بیش دو ہزار اشعار ہیں مگر جس چیز نے آپ کا نام زندہ رکھا ہے وہ کرشن کنھیا کی جان بخش فسوں کاریوں اور سرور انگیز کارفرمائیوں کے راگ ہیں۔"

کرشن بھگتی کے سلسلے میں آپ کی شاہکار مثنوی بزمِ بندرابن اردو

Scanned by CamScanner

ادب میں یقیناً ایک یادگار کارنامہ ہے۔ بزمِ بندرابن اردو مثنوی نگاری میں بھگتی اسکول کا آغاز کرتی ہے۔ جس کے نمائندے برقؔ دہلوی، رونقؔ دہلوی، مہرؔ دہلوی شیداؔ دہلوی، جگرؔ بریلوی، منورؔ لکھنوی وغیرہ ہیں۔ شعلہ کی مثنوی کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انہیں بیانیہ شاعری میں استادی کا درجہ حاصل تھا۔ پوری مثنوی میں بڑی پختگی شگفتگی اور روانی ہے۔ جگرؔ بریلوی یادِ رفتگاں میں اس مثنوی کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"شری کرشن جی کی بھگتی میں بالکل رنگ گئے۔ ڈوب ڈوب کے قلبی کیفیتوں اور حسنِ عالم افروز کی کرشمہ سازیوں کے ترانے سنانے لگے ـــ وہ ترانے جن پر روح وجد کرتی ہے۔ اس رنگ کی آپ کی ایک مستقل تصنیف بزمِ بندرابن ہے۔ جسے پریم کے پجاری حرزِ جاں بنائے رکھتے ہیں اور اس کے بعض حصوں کا بڑی عقیدت سے روزانہ پاٹھ کرتے ہیں شاعری کے تمام جوہر اصلی آب و تاب کے ساتھ اس تصنیف میں نمایاں ہیں۔ جوش رنگینی، مصوری، برجستگی شدت و لطافت جذبات سبھی کچھ ہے البتہ زبان میں ہندی کی آمیزش زیادہ ہے۔ بزمِ بندرابن کی ابتدا اس جوش سے ہوتی ہے جیسے پہاڑ سے آبشار ابلتا ہے۔"

اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

شری جگدیش بندرابن بہاری　　شری رادھا رمن مادھو مراری
شری گوبند رادھا کرشن گوپال　　مدن موہن شری گھنشام نند لال
شری مرلی منوہر شیام سندر　　شری بھگوان گوپی ناتھ گردھر
شری جادو پت شری بانکے بہاری　　چتر بھج شیام مورت چکر دھاری
مکٹ دھاری مدن گوپال موہن　　نول سندر چھبیلے لال موہن
تو ہی ہے حسنِ رخسارِ حقیقت　　تو ہی ہے پردہ بردارِ حقیقت
تو ہی ہے جلوہ فرمائے دو عالم　　تو ہی ہے خود تماشائے دو عالم
تو ہی پروانہ تو ہی شمعِ محفل　　تو ہی گلبن تو ہی شورِ عنادل
بت و چت چور ماکھن کے لٹیرے　　حیات و موت دونوں کھیل تیرے
نمودِ آفرینش ہے تجھی سے　　وجودِ آفرینش ہے تجھی سے

الگ کب تجھ سے تیری گفتگو ہے ‏ ‏ غرض اک تو ہی تو ہے تو ہی تو ہے

عرضداشت کے عنوان سے بنسی والے کے چرنوں میں نویدن کرتے ہیں:

عجب ہے کچھ مری حالت کا اظہار ‏ ‏ سراسر ہوں ادھم پاپی گنہگار
نہ لائق التماس و التجا کے ‏ ‏ نہ قابل اپنی عرضِ مدعا کے
ندامت نامۂ اعمال سے ہے ‏ ‏ خجالت آپ اپنے حال سے ہے
نکما ہوں نکمی زندگی ہے ‏ ‏ مری ہستی تو خود شرمندگی ہے
وہ آوارہ وطن جس نے نہ دیکھا ‏ ‏ وہ بلبل ہوں چمن جس نے نہ دیکھا
الگ ہوں دور ہوں سب سے جدا ہوں ‏ ‏ عجب بیکس ہوں بے برگ و نوا ہوں
نہ کوئی چھوڑ جانے کی نشانی ‏ ‏ نہ کوئی یادگارِ زندگانی!
نہیں چھونے کے قابل جسم ناپاک ‏ ‏ ملے گی کس طرح سے خاک میں خاک
غرض جو کچھ ہوں سب تجھ کو خبر ہے ‏ ‏ مرا انجام کیا مدِ نظر ہے
ہمیشہ ہے گنہگاروں پہ رحمت ‏ ‏ ہمیشہ ہے تری بخشش کی عادت
برا ہے وقت وہ جس کا کہ ڈر ہے ‏ ‏ سماں یہ ہے کہ جو پیشِ نظر ہے
دمِ آخر رواں آنکھوں میں ہوگا ‏ ‏ کسی دن یہ سماں آنکھوں میں ہوگا
بدلتی ہوں محبت کی نگاہیں! ‏ ‏ ہر اک جانب ہوں حسرت کی نگاہیں
ہجومِ اہلِ ماتم ہوں سرہانے ‏ ‏ عزیز و اقربا، خویش اور بیگانے
مرے ہر کام باہم بٹ رہے ہوں ‏ ‏ اٹھانے والے بھائی چھٹ رہے ہوں
غرض سامانِ رخصت جب ہو تیار ‏ ‏ پڑے جان اور اجل میں آ کے تکرار
اُسے تعجیل ہو حکمِ قضا کی ‏ ‏ اُسے ہو ڈھیل عرضِ مدعا کی
وہ پھرتی ہو کہ آگے دھر کے نکلوں ‏ ‏ یہ مچلی ہو کہ درشن کر کے نکلوں
پڑا جھگڑا ہو کچھ آپس میں بھاری ‏ ‏ وہ کیا بس اک تمہاری انتظاری
نظر آ جائے چھب بانکی ادا کی ‏ ‏ مندیں آنکھیں تو ہو جھانکی ادا کی
تصورِ رشتۂ جاں میں جکڑ لوں ‏ ‏ چھٹے جب نبض تب دامن پکڑ لوں
جب آئے آنکھ میں دم پران پیارے ‏ ‏ لگا ہو دھیان چرنوں میں تمہارے

نظم "جھانکی" میں شفقتہ نے مرلی والے سے درشن دینے کی تمنا اس صورت سے ظاہر کی ہے

کدم کی چھانو ہو جمنا کا تٹ ہو　　ادھر مرلی ہو ماتھے پر مکٹ ہو
کھڑے ہوں آپ اک بانکی ادا سے　　مکٹ جھونکوں میں ہو موج ہوا سے
کسی نازک کمر ہو کاچھنی سے　　بندھی بنسی ہو جامے کی تنی سے
بھری گجروں سے ہو نازک کلائی　　بنے ہو برگِ گل دستِ حنائی
برابر ہوں شری رادھا کشوری　　مدھر سر بانس کی بجتی ہو پوری
تبسم ہو درِ نظارہ باہم　　عیاں اک چھب میں ہو حسنِ دو عالم
جدا ہوں گو برائے نام دونوں　　بنے ہوں ایک رادھا شیام دونوں

بہم دیگر ہو عکسِ حسن زیبا
کنھیا رادھا ہوں رادھا کنھیا

شعلہ نے مریادہ پرشوتم بھگوان رام چندر جی کے حالات کو اپنے ایک مسدس "جنگ نندنی" میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اُن کا یہ مسدس اردو ادب میں ایک ادبی شاہکار ہے۔ سیتا جی رام چندر جی کے ساتھ بن جانے کے لئے اصرار کرتی ہیں شعلہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

ہر دم رہے گا نقشِ کفِ پا نگاہ میں
آنکھیں بچھاتی جاؤں گی صحرا کی راہ میں

رام چندر جی، لکشمن جی اور سیتا جی بن جانے کے لئے اجودھیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ تو اُن کی ماتاؤں کے دل پر کیا گزرتی ہے۔

سنبھلے بدن نہ ضعف سے گر گر کے رہ گئیں
نکلی نہ جان پتلیاں پھر پھر کے رہ گئیں

دشرتھ کی قلبی کیفیات کی آئینہ داری دیکھئے۔

پتروں کو دیکھ آتما آنند ہو گئی
آشیرباد دے کے زباں بند ہو گئی

بن باس کے زمانے کے رام چندر جی، سیتا جی اور لکشمن جی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اُسے ملاحظہ کیجئے۔

رام اور لکشمن کے ساتھ میں سیتا جی یوں رواں　　جس طرح برہم و جیو کے مایا ہو درمیاں

یوں پر یہ جانکی تھیں مہ و خور کے بیچ میں   جیسے ہو پریم بھگت اور ایشور کے بیچ میں

شری رام چندر جی، لکشمن جی اور سیتا جی کو سرجو ندی کو پار کرنا ہے اور کشتی کا انتظار ہے۔ شعلہ صاحب نے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے۔

بے ناؤ کر رہے ہیں جو برہمانڈ بھر کو پار   اپنے لئے ہے آج انہیں کشتی کا انتظار

پل مارتے ہی ناؤ کنارے پہ آ لگی
ابرو کی طرح کشتی اشارے پہ آ لگی

بن باس میں سیتا جی سے بن کی باسی عورتیں اُن کا حال دریافت کرتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ یہ دو جواں مرد جو اُن کے ہمراہ ہیں کون ہیں۔ سیتا جی فرماتی ہیں ؎

دیور لکھن کو رشتے میں بتلا کے رہ گئیں
رگھبر کا ناتا پوچھا تو مُسکا کے رہ گئیں

جنگل کے رہنے والوں نے شری رام چندر جی، سیتا جی اور لکشمن جی کا استقبال بڑے زور و شور کے ساتھ کیا۔

تل بھر جگہ نہ پائی کہیں گردِ راہ نے
چرنوں کو ڈھک لیا تھا ہجومِ نگاہ نے

مہاراجہ پٹیالہ اور مہاراجہ کپور تھلہ نے بزم برندابن کی بڑی قدر کی۔ متھرا، برندابن، بنارس وغیرہ دھارمک استھانوں پر بھارت دھرم مہامنڈل کے جلسوں میں شعلہ بھی اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔ وہاں وہ لاکھوں کرشن بھگتوں اور رام بھگتوں کے سامنے اپنی بزم برندابن اور "جنگ نندنی" سناتے اور اُن سے خراجِ تحسین وصول کرتے۔ بھارت دھرم مہامنڈل نے "جنگ نندنی" اور بزم برندابن ہندی اور اردو رسم الخط میں شائع کرا کے سارے ہندوستان میں ان دونوں کتابوں کو مفت تقسیم کرایا تھا۔

شعلہ اردو کے غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے کرشن بھومی متھرا کی شان میں "برج راج" کے عنوان سے پورا ایک مسدس لکھا ہے۔ اس مسدس کے دو بند ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ وہ ہے زمیں جس کو زمیں کہہ نہیں سکتے   اُونچا ہی سہی پر عرشِ بریں کہہ نہیں سکتے
تاباں ہی سہی پر مہ کی جبیں کہہ نہیں سکتے   چپ ہیں کہ چناں اور چنیں کہہ نہیں سکتے

Scanned by CamScanner

روشن ہے کہ یہ سجدہ گہِ اہلِ یقیں ہے
جو ذرہ ہے یاں خاتمِ قدرت کا نگیں ہے

ہر وقت نظر آتا ہے یاں جلوہ جا و دید — اُٹھا ہے یہیں آکے نقابِ رُخِ توحید
ایک ماہ میں یاں تیس نکلتے ہیں مہِ عید — چھپتا نہیں ہے شام کو بھی برج کا خورشید

آتی ہے ہنسی ذرّوں کو تاروں کی چمک پر
یہ وہ ہے زمیں پاؤں نہ رکھے جو فلک پر

شعلہ نے پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کی۔ لیکن دوسری بیوی بھی چند ہی سال کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہ دونوں صدمے آپ کو بہت شاق گزرے۔ دونوں کی یاد میں آپ نے نوحے لکھے ہیں جو بڑے دردناک ہیں۔ اور جذبات کا ایک دفتر لئے ہوئے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

سرکا ہوا زانو سے مرے کس لئے سر ہے — تاثیر دوا میں نہ دعاؤں میں اثر ہے
کیوں میری طرف دیکھ کے حسرت کی نظر ہے — کیا سچ ہے کہ مرنے کی تمہیں اپنے خبر ہے

کیا جی پہ بنی آکے جو دم توڑ رہے ہو
کیا میں نے کہا ہاتھ یہ کیوں جوڑ رہے ہو

شعلہ اپنے وقت کے ایک اچھے غزل گو بھی تھے۔ اُن کی غزلوں میں وہ تمام خوبی محاسن اور روایات ملتی ہیں جو اُن کے دور کے دہلی اسکول کے شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ متانت و سنجیدگی، شگفتگی اور ترنم کے ساتھ ساتھ اُن کی غزلوں میں بلند پروازی، نازک خیالی اور اندازِ بیان کی ندرت کے اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ فگر بریلوی "یادِ رفتگاں" میں رقمطراز ہیں۔

"آپ کی غزلوں میں بلند پروازی، معنی آفرینی، نازک خیالی، ولولہ انگیزی اور جوش کے بہت نمونے ملتے ہیں۔ طرزِ ادا میں شوکت و تجمل، برجستگی و دل کشی ہے۔ تشبیہات و استعارات بھی پختہ ہیں۔ بعض اوقات خوبصورت بندشوں اور رنگین ترکیبوں کے شعر میں عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جب صاف کہتے ہیں تو بڑے مزیدار اور پُر اثر شعر کہتے ہیں۔"

Scanned by CamScanner

شعلہ کے چند اشعار یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان میں کہیں شاعرانہ بلند پروازی ہے۔ کہیں معنی آفرینی اور نازک خیالی ہے، کہیں رنگینی اور معنویت ہے اور کہیں بے ساختگی اور آمد۔

میں جبہ سا ہوں اس درِ عالی مقام کا | کعبہ جہاں جواب نہ پائے سلام کا
سکہ رواں ہے کس بتِ محشر خرام کا | نقشِ قدم نگیں ہے قیامت کے نام کا

آئی صبحِ ازل چاک گریبانوں میں | ورنہ پہلے تو ہمیں تھے ترے دیوانوں میں

ناتوانی میں سخت جانی ہے | ضعف بھی طاقت آزما نکلا

خورشید آسماں پہ گیا تو زمیں پہ ہے | میزانِ حسن میں ترا پلہ گراں رہا

محشر بھی کوئی درد ہے جو اُٹھ کے رہ گیا | شکوہ بھی کوئی غم ہے جو دل میں نہاں رہا
جینے میں کیا مزہ جو نہیں موت کا یقیں | مرنے میں لطف کیا ہے جو وہ بدگماں رہا

خنجر پہ نظر ہے کبھی دامن پہ نظر ہے | کون آتا ہے محشر میں وہ گھبرائے ہوئے ہیں

چھپا ہوا سا ہے طرزِ حجاب شوخی میں | کھلی کھلی ہوئی شوخی ترے حجاب میں ہے

وہ چھپتے پھرتے ہیں گھبرائے کیا قیامت ہے | یہ کون عرصۂ محشر میں بیقرار آیا

خاک عاشق ہے کہ اٹھ اٹھ کے قدم لیتی ہے | اور وہ جاتا ہے اُٹھائے ہوئے داماں کیسا

کیا زیست دو روزہ کے لئے آئے ہیں عدم سے
اس جینے میں مرنے کا بھی ساماں نہیں ہوتا

Scanned by CamScanner

نہ کفن ہے، نہ لحد ہے، نہ جنازہ، نہ مزار
شمع! کیا ماتم پروانہ کا ساماں ہوگا

یہ بیتابی نہیں تھوڑی، یہ بےچینی نہیں تھوڑی
کرے گا درد جانے اور کیا اس سے سوا ہو کر

شعلہ کو کائستھ کانفرنسوں کے موقعوں پر بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ شعلہؔ کے دل میں اپنے فرقے کا بڑا درد تھا۔ اس لئے وہ ان کانفرنسوں میں کائستھوں کے سلسلے میں اکثر اپنے نو تصنیف مسدس سنایا کرتے تھے۔ یہ مسدس اُن کے کلیات میں بھی ملتے ہیں۔

منشی جوالا پرشاد برق

جوالا پرشاد نام، برق تخلص، قصبہ محمدی ضلع لکھیم پور کھیری میں ۱۲؍ اکتوبر ۱۸۶۳ء
کو پیدا ہوئے۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر چکبست، رام بابو سکسینہ اور دوسرے تذکرہ
نویسوں اور ادیبوں نے لکھا ہے کہ برق ضلع سیتاپور قصبہ محمدی میں پیدا ہوئے
یہ صحیح نہیں ہے۔ محمدی ضلع لکھیم پور کھیری کا ایک معروف قصبہ ہے نہ کہ
سیتاپور کا۔ آپ ایک معزز شریواستو کائستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خواجہ
عشرت لکھنوی نے اپنی کتاب ہند و شعراء میں آپ کو پنڈت لکھا ہے۔ یہ
غلطی کبھی زیادہ تر تذکرہ نویسوں اور ادیبوں نے کی ہے۔ آپ کے والد منشی شیو
دیال صاحب جو قصبہ محمدی کے راجہ کے یہاں دیوان تھے۔ بڑے عالم و فاضل
بزرگ ہوئے ہیں۔ برق بچپن ہی سے نہایت ذہین تھے۔ آپ کی ابتدائی
تعلیم قصبہ محمدی میں ہوئی۔ آپ نے ۱۸۷۸ء میں ضلع لکھیم پور کھیری سے انٹرینس
کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا اور ۱۸۷۹ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہو
گئے۔ ۱۸ سال کی عمر میں بی۔اے کا امتحان اول درجے میں پاس کرنے کے بعد کیننگ
کالج لکھنؤ ہی میں اسسٹنٹ انگلش پروفیسر مقرر ہوئے۔ ایک سال کے بعد
آپ نے ۱۸۸۳ء میں وکالت ہائی کورٹ کا امتحان پاس کیا اور خدائے قوم منشی کالی
پرشاد کے دامن عاطفت میں تقریباً دو سال تک وکالت کی۔ لیکن ۱۸۸۵ء میں وکالت
ترک کر دی۔ پھر گورنمنٹ نے آپ کو منصف کے عہدے پر فائز کر دیا۔ منصفی سے
ترقی کرکے سب جج اور کئی مرتبہ قائم مقام سشن جج ہوئے۔

Scanned by CamScanner

آپ ۱۹۰۹ء میں گریفس کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ پھر جج خفیفہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ۲۶ر جنوری ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں بہ عارضۂ طاعون انتقال کیا۔ اس وقت آپ جج خفیفہ لکھنؤ کے عہدے پر فائز تھے۔ منشی دیانرائن نگم نے زمانہ مارچ ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں آپ کے مختصر حالات زندگی مع تصویر شائع کئے۔ اس میں آپ کی تاریخِ وفات ۶ر مارچ ۱۹۱۱ء درج ہے جو صحیح نہیں ہے۔ برقؔ کے بھائی منشی جانکی پرشاد کے لکھے ہوئے حالات زندگی ادیب الہ آباد بابتہ اپریل ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں منشی جانکی پرشاد رقم طراز ہیں۔

"بالآخر ۲۶ر مارچ ۱۹۱۱ء کو بوقت تین بجکر (۲۰) بیس منٹ پر اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔"

برقؔ کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں ہمارے ادبی مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ اس لئے اُن کے بھائی منشی جانکی پرشاد کے تحریر کردہ حالاتِ زندگی یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ جو ادیبؔ بابتہ اپریل ۱۹۱۱ء کے ایڈیٹوریل میں صفحہ ۲۰۲ اور ۲۰۴ پر شائع ہوئے ہیں۔

"منشی جوالا پرشاد صاحب بتاریخ ۱۰ر اکتوبر ۱۸۶۳ء یوم دسہرہ ماہ کنوار بمقام قصبہ محمدی ضلع کھیری پیدا ہوئے تھے۔ بزرگان منشی صاحب مرحوم قصبہ شاہ آباد ضلع ہردوئی کے باشندے تھے۔ جد ماجد منشی نین سکھ عہدۂ جلیلہ پر بہ عہدِ شاہی ممتاز تھے اور اسی سلسلے قیام محمدی میں ہو گیا والد ماجد منشی شیو دیال صاحب بھی عہد شاہی میں ممتاز رہے۔ منشی صاحب مرحوم بچپن سے خاموش محنتی اور شائق علم رہے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں مڈل پاس کر کے انٹرنس ایف۔ اے اور بی۔ اے میں برابر اوّل درجہ پاس ہوتے گئے۔ بی۔ اے پاس کر کے آپ اسسٹنٹ انگلش پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ میں مقرر ہوئے۔ اور اسی زمانے میں قانون بہ مشورہ منشی کالی پرشاد صاحب مرحوم کل بھاسکر بانی کایستھ پاٹھ شالہ الہ آباد حاصل کیا۔ بی۔ اے کے امتحان کے ایک سال کے بعد ہائی کورٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ تخمیناً

ایک سال وکالت عدالت العالیہ صاحب جوڈیشل کمشنر بہادر میں کر کے منصف ۱۸۸۵ء میں مقرر ہوئے۔ منصفی سے ترقی کر کے سب جج اور کئی دفعہ قائم مقام سشن جج مقرر ہوئے۔ بالآخر ۲۶ مارچ ۱۹۱۱ء کو بوقت تین بجکر بیس منٹ پر اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔"

آپ کی وفات پر ۶ اپریل ۱۹۱۱ء کو ایک تعزیتی جلسہ قیصر باغ لکھنؤ میں ہوا تھا۔ اس میں اردو کے نامور اساتذہ اور شاعروں کے علاوہ ہزاروں شہریوں نے شرکت کی تھی۔ صفی لکھنوی نے اس تعزیتی جلسے میں، جو قطعۂ تاریخ وفات پڑھا تھا۔ وہ بیحد پسند کیا گیا تھا۔ اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جج خفیفہ کے خوش اخلاق جوالا پرشاد
برق ہر کام میں تھے برق زہے ذہنِ رسا

بات سنتے ہی معاملہ کو پہنچ جاتے تھے
لطف بہتے ہوئے دریا میں ہے غواصی کا

دل کے حالات قیافہ سے بتا دیتے تھے
مشغلہ روز عدالت میں یہی رہتا تھا

طبع سنجیدہ تھی ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح
رنگ تہذیب و متانت کا نہایت گہرا

اک سمویا ہوا برتاؤ سبھوں سے یکساں
کارِ سرکار میں نرمی نہ درشتی بیجا

رنگ انصاف میں ڈوبا ہوا اندازِ نگاہ
شوخیِ جنبشِ مژگاں سے ذہانت پیدا

نہ گرجتے تھے کسی پر نہ برستے تھے کبھی
برق کا کام اشاروں پہ فقط چلتا تھا

آنے جانے میں عدالت کے یہ پابندیِ وقت
کام کتنا بھی زیادہ ہو مگر کیا پروا

ختم کر دینا انہیں چار بجے تک سب کام
کہ نہ سائل ہوں پریشاں نہ زچ ہوں وکلا

کارِ امروز بفردا مگذار اس پہ عمل
کام میں طول نہ کوتہ قلمی حد سے سوا

تجربہ کار نگاہیں ہمہ دان و ہمہ گیر
نکتہ نکتہ پہ نظر سامنے ہر فنی دعویٰ

صاف سلجھی ہوئی تقریر بھی تہذیبی سب
نہ کہیں جھول عبارت میں نہ الجھاؤ ذرا

نکتہ چینوں سے نہ ٹوٹے یہ طلسمِ تجویز
فیصلہ میں وہ سلیقہ کہ نہ دیکھا نہ سنا

کرسیِ عدل پہ جج جج کی ملاقات میں دوست
صحبتِ شعر و سخن ہو تو ادیبِ یکتا

بذلہ سنجی میں سخن ساز طبیعت حاضر
نقرے نقرے میں ظرافت کا نمک شور افزا

جائیے گھر پہ جو ملنے تو ملنسار بڑے
آئے جب وہ اجلاس تو انداز جدا

ڈٹ کے کرسی پہ جہاں بیٹھ گئے شیر کی طرح
رعب چہرے پہ خداداد نظر ہوش رُبا

مذہبی رنگ تعصب کا کہیں نام نہیں
دل کے آئینہ پہ آزاد خیالی کی جلا

جج میں جتنی صفتیں چاہئیں وہ سب تھیں موجود
اب دن آئے تھے کہ عہدہ کوئی ملتا اعلےٰ

یوں تو مرنا ہے سبھی کو مگر افسوس اے برقؔ
اجل آئی تمہیں بے وقت قلق ہے اس کا

لکھنؤ یہ تری قسمت کہ ترے ہاتھ سے آہ
ہو گیا گم وہ نگینہ کہ جو تھا بیش بہا

دیکھنا ٹوٹ رہے ہیں یہ ستارے کیسے
رو رہی ہے کسے اردو کی ستم کش دنیا

کس کے افسوس میں ہیں شیکسپیئر کی جلدیں
کون اردو میں کرے گا وہ خیالات ادا

ترجمہ تیرے لئے چھوڑ گیا دیکھ اردو
تیرے سرمایۂ نازش کا بڑھانے والا

یادگار اس سے کوئی اور نہ ہوگی بہتر
کہ اشاعت سے تصانیف کو دی جائے بقا

کام باقی تھا بہت کچھ مگر افسوس افسوس
ساتھ تو نے نہ دیا زندگی سست وفا

مبتلا تپ میں ہوئے مارچ کی اکتیس کو
اور چھبیس دن کو آ گیا پیغام قضا

سن چھیالیس برس تین مہینے کا ابھی!
ساخت اعضا کی نہ کمزور نہ کمزور قویٰ!

ہائے کیا کہئے دن گو کہ نہ تھے مرنے کے
لے گئی چھین کے احباب سے کج بخت وبا

ان کی اولاد کو اور ان کے عزیزوں کو تمام
تعزیت دیجئے اللہ کرے صبر عطا

آپ اے برقؔ جہاں رہیئے وہاں خوش رہیئے
خوش رہے آپ سے دنیا میں سب اعلیٰ ادنیٰ

نگہ برقؔ سے گویا کشش برقی تھی
سبق آموز محبت تھی ہر اک طرز ادا

تیرے شعلوں نے لیا برقؔ کو آغوش میں جب
اُف غم انگیز جگر سوز شرر خیز چتا

دل احباب میں اک آگ لگا دی غم نے
حشر تک جو نہ بجھے گا نہ بجھے گی اصلا

لکھنے بیٹھا ہے صفیؔ برقؔ کی تاریخ وفات
دل رنجیدہ پہ چھائی ہے غم انگیز گھٹا

سنہ ۱۹۱۱ء

برقؔ کی وفات پر رسالہ ادیب الہ آباد کے اڈیٹر منشی نوبت رائے نظرؔ لکھنوی نے اپریل ۱۹۱۱ء کی اشاعت کے ایڈیٹوریل میں آپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا۔

"منشی جوالہ پرشاد برقؔ بی۔اے۔ جج خفیفہ لکھنؤ کی افسوسناک وفات

اردو زبان کے لئے ایک سخت ماتم ہے۔ جن لوگوں نے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو نظم و نثر میں آپ کی فصاحت اور شیوا بیانی کیا درجہ رکھتی تھی۔ بنکم چندر اور شکسپیر کی تصنیفات کو فصیح اردو کا لباس دینا مرحوم پر ختم تھا۔ اُن یگانۂ آفاق مصنفوں کی اعلیٰ فصاحت منشی صاحب کے اُردو ترجموں میں اس طرح جلوہ گر ہے جس طرح آئینہ میں عکس۔ آخر میں شیکسپیر کی تمام تصنیفات کا ترجمہ کر رہے تھے۔ کہ پیامِ اجل آگیا۔ ظرافت میں بھی آپ کو خاص دستگاہ حاصل تھی۔ اور اودھ پنچ کے صفحات آپ کے فیضانِ قلم سے ہمیشہ سیراب ہوتے رہے۔ قانون کے لئے بھی آپ نے خاص دماغ پایا تھا۔ اور آپ کی بینظیر جوڈیشل خدمات کا سرکاری طور پہ اعتراف کیا گیا ہے۔ مرحوم کی وفات سے نہ صرف اردو کا ایک فصیح البیان مصنف ایک زندہ دل اور ظریف الطبع شاعر ایک بے نظیر جج اور لکھنؤ کی سوسائٹی کا ایک اعلیٰ ممبر اُٹھ گیا ہے بلکہ قوم کائستھ کا ایک رکن رکین اور مایۂ ناز فرد کم ہو گیا جو ہمارے لئے ایک صبر آزما قومی سانحہ ہے۔"

چکبست لکھنوی مضامینِ چکبست میں برقؔ پر اپنے مقالے میں یوں رقم طراز ہیں:

"منشی صاحب موصوف ان معدودے چند لوگوں میں تھے جنھوں نے ابتدا سے اودھ پنچ کے پودے کو سینچا۔ اُن کی ذہانت اور طباعی ضرب المثل تھی اور زبان دانی اور شاعری کے اعتبار سے لکھنؤ کے سخن سنجوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ علاوہ چھوٹی چھوٹی نظموں کے جو اودھ پنچ میں اکثر شائع ہوئیں۔ مثنوی بہار اور معشوقہ فرنگ جو کہ رومیو جولیٹ کا ترجمہ ہے اُن کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ مثنوی بہار کی دلچسپی اور اختصار کو دیکھ کر سر سید احمد خاں مرحوم نے فرمایا تھا۔"

روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

برقؔ لکھنوی کی تصانیف جو میرے کتب خانے میں محفوظ ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔

(۱) بنگالی دلہن:۔ یہ بنکم چندر چٹرجی کے مشہور ناول دیوی چودھرانی کا ترجمہ ہے اسے مطبع منشی نول کشور لکھنؤ نے ۱۹۲۱ء میں شائع کیا تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد

یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کوئی ترجمہ ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل ناول ہی اسی زبان میں لکھا گیا ہے

(۲) مرنالنی۔ یہ بھی بنکم چندر چٹرجی کے ناول مرنالنی کا فصیح اور با محاورہ اردو میں ترجمہ ہے۔ اس ناول میں ایک دوشیزہ کا سراپا اور حسن کی تعریف بیان کی گئی ہے جسے پڑھ کر رینالڈس کے سراپے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ ترجمے میں اصل کا لطف پیدا کرنا زبان و بیان پر کامل قدرت رکھنے کی دلیل ہے۔ برق کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ ترجمہ میں طبع زاد تصنیف کا لطف پیدا کر دیتے تھے۔ یہ ناول اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ اس کے تین ایڈیشن منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئے ہیں۔

(۳) مار آستین:۔ مشہور بنگالی ناول بشابرکش کا ترجمہ ہے۔ اس ناول میں اخلاقی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ترجمے کی تعریف سرایڈون آرنلڈ نے کی تھی۔ جو انگریزی زبان کے ایک بلند پایہ نقاد تھے۔ اب تھیٹریکل کمپنیاں برق کے اس ناول کا تماشہ دکھاتی ہیں۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جس وقت لکھنؤ کے محلہ گول گنج سے برق کا جنازہ جا رہا تھا اس وقت مار آستین کا ڈرامہ ایک تھیٹریکل کمپنی کھیل رہی تھی۔

(۴) دھنی:۔ یہ بھی ایک دلچسپ اور بے مثل ناول ہے اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۵) معشوقۂ فرنگ:۔ یہ شکسپیر کے مشہور ڈرامے رومیو اینڈ جولیٹ کا منظوم ترجمہ ہے۔ رومیو اور جولیٹ کا ترجمہ برق نے سب سے پہلے "فیروز گلناز" کے نام سے کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا اڈیشن معشوقۂ فرنگ کے نام سے ۱۹۱۱ء میں نول کشور پریس سے شائع ہوا۔ اردو کے بعض ادیبوں نے "فیروز گلناز" اور "معشوقۂ فرنگ" سے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ برق کی دو الگ الگ تصنیفیں ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ایک چیز کے دو نام ہیں۔ اس ڈرامے کے افراد قصہ لکھنؤ کے ظہور الدولہ، ریاض، غفور الدولہ، مشرف اور پادری یا راہب کے بجائے قاضی صاحب نظر آتے ہیں۔

(۲) مثنوی بہار :۔ اس مثنوی کے کئی اڈیشن مختلف مطبعوں سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے دو ایڈیشن میری لائبریری میں محفوظ ہیں جو نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ ایک مثنوی ہی برق کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ لکھنؤ اسکول کو اس مثنوی پر ناز ہے۔ حامد اللہ افسر میرٹھی اپنی کتاب "تنقیدی اصول اور نظریے" میں مثنوی بہار کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"منشی جوالہ پرشاد برق کی مشہور مثنوی بہار سلاست، روانی اور نازک خیالی میں لاجواب ہے۔ برق کو خارجی کیفیات کے نظم کرنے میں ید طولے حاصل تھا۔"

غرض برق ایک بلند پایہ ناول نگار اور مترجم تھے آپ نے بنگالی ناولوں کے ترجمے اس خوبصورتی اور صفائی کے ساتھ سلیس عبارت میں کئے ہیں کہ اُن میں اصل کی روح سما گئی ہے۔ آپ کے طبعزاد ناولوں میں پرتاپ اور روحنی قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں آپ کی افسانہ نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں آپ نے اپنے ناولوں میں غیر ملکی نونما نہیں پیدا ہونے دی ہے۔ اُن کے ناولوں میں وطن پرستی کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ منشی پریم چند برق کے بنگالی ناولوں کے ترجموں سے بہت متاثر ہوئے تھے اور اُن کی افسانہ نگاری کی ابتدا ان ہی ترجموں کو پڑھ کر ہوئی تھی۔ پروفیسر محمد حسن محوی صدیقی لکھنوی کا ایک مقالہ "ہمارے افسانے" رسالہ 'زمانہ' کانپور بابتہ جولائی ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں برق کے ناولوں کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

"بنگال کے سحر نگار ناول نگار بنکم چندر چٹرجی کے اکثر و بیشتر ناولوں کا ترجمہ لکھنؤ کے مشہور و نامور ادیب و انشا پرداز منشی جوالہ پرشاد برق اکبر آبادی نے کیا تھا۔ برق زبردست شاعر اور عدالت خفیفہ کے جج تھے۔ اور جن کی لال کوٹھی کبھی جھاؤلال کے پل پر مشہور تھی۔ تقریباً اُن کے سب ناول نول کشور پریس لکھنؤ میں چھپے اور ملتے ہیں۔ یہ ترجمہ زبان اور افسانوی حیثیت سے لاجواب ہیں۔"

جگر بریلوی یادِ رفتگاں میں آپ کے ناولوں کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

Scanned by CamScanner

"آپ کے بنگالی ناولوں کے ترجموں میں اصل کی سی تازگی اور لطف ہے
طبعزاد ناولوں کا کیا کہنا۔ سراپا بیان کرنے میں تو آپ یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ مرد ہو یا
عورت اس کی چلتی پھرتی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ مناظر کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ایک
سماں پیدا کر دیتے ہیں۔ بالکل قدرتی دلفریب فضائیں، ہوائیں، تازگیاں، شگفتگیاں
آنکھوں کو فرحت اور دل کو سرور بخشنے لگتی ہیں۔ شادمانیوں کا ذکر کرتے ہیں
تو کلیجہ اچھلنے لگتا ہے۔ رنج و غم کا بیان کرتے ہیں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ کردار
نگاری پر یہ قدرت ہے کہ قصوں کے افراد جیتے جاگتے چلتے پھرتے مختلف
الخصال انسان نظر آتے ہیں۔ زبان کی سلاست، پاکیزگی اور فصاحت ادب
کا معیار ہے۔"

منشی جوالا پرشاد برق اپنے زمانے کے بہترین نثر نگار اور اردو نظم میں
ایک خاص طرز کے موجد تھے۔ آپ کا منظوم ڈرامہ معشوقۂ فرنگ اور
مثنوی بہار ہمیشہ زندہ رہنے والی چیزیں ہیں۔ مثنوی بہار ایک اعلیٰ درجہ
کی تصنیف ہے۔ سلاست، برجستگی، شگفتگی اور روانی کے لحاظ سے سحر البیان،
گلزارِ نسیم، زہرِ عشق اور پیامِ ساوتری کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسری
مثنوی اس کے مقابلے میں پیش کی جا سکے۔ جس طرح انگریزی ادب میں مختصر
نظموں میں گرے کی نظم ایلجی (ELEGY) کا جواب نہیں ملتا اسی طرح اردو
ادب میں بھی مثنوی بہار لاجواب ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ گرے
کی نظم حزنیہ ہے اور مثنوی بہار طربیہ ہے۔ جگر بریلوی یادِ رفتگاں میں
برق پر اپنے مقالے میں مثنوی بہار کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"مثنوی بہار کی کبھی کبھی زیارت ہو جاتی ہے۔ اس مثنوی کا کیا کہنا
زبان و بیان کی خوبیوں کی داد نہیں دی جا سکتی۔ واقعی عروسِ بہار کی تصویر
کھینچ دی ہے۔ ایسی حسین رنگین اور پاکیزہ نظم ہے جس کی نظیر نہیں ایک
طرف محاوروں کا لطف بندشوں کی لطافت ترکیبوں کا تناسب و تقابل، مطالب
کا ربط و تسلسل خیالات کی شگفتگی دوسری طرف قانونِ روئیدگی و بالیدگی کی
نزاکتوں کا انکشاف نشوونما کی مسلسل کیفیتوں کا نقشہ کھیتی کے کاموں کی جزئیات

تغیرات موسم سے کاشتکاروں کے امید و بیم کی حالتیں، جنگل، پہاڑ اور کھیتوں میں ابر و باراں اور بہاروں کا سماں، حسینوں اور مہ جبینوں کے جوش، شوق اور لوگوں کا عالم کس کس بات کی تعریف کی جائے صفائی اور روانی کا یہ عالم ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف و شفاف نہر اٹھلاتی، بل کھاتی چمنستان میں موجیں مارتی چلی جاتی ہے۔ سر سید احمد خاں نے اس مثنوی کے متعلق سچ کہا تھا۔

روئے گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد

مثنوی بہار کے کچھ اشعار اِدھر اُدھر سے پیش کئے جاتے ہیں۔ موسم بہار کی آمد کا ذکر شاعر نے اس طرح کیا ہے کہ موسم بہار کی تصویر ہی کھینچ دی ہے۔

اٹھلاتی، لجاتی، مسکراتی / کس ناز سے ہے بہار آتی
کمسن، الھڑ، حسیں، انیلی / چوتھی کی دلہن نئی نویلی
بوٹا سا وہ قد بہار کے دن / اٹھتی کونپل ابھار کے دن
گہنا پھولوں کا زیب تن کر / دھانی جوڑا نیا پہن کر
گھونگھٹ اک ناز سے نکالے / سہرا پھولوں کا منہ پہ ڈالے
اتری گلشن میں جب سواری / سورج نے آرتی اتاری
گل نے زرِ گل کیا نچھاور / صدقے ہوئی عندلیب اڑ کر
خوشیاں اشجار نے منائیں / میووں کی ڈالیاں لگائیں
غنچوں نے چٹک کے لیں بلائیں / بلبل نے چہک کے دیں دعائیں
بھوروں نے یہ گونج کر صدا دی / کوئل نے یہ پھیر دی منادی

معشوقۂ گل عذار آئی
آئی آئی بہار آئی

کسان کھیتی باڑی میں کس طرح اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے۔ ان اشعار میں ملاحظہ کیجئے۔

گھر سے اپنے کسان نکلے / بوڑھے، بالے، جوان نکلے
تاروں کی چھاؤں منہ اندھیرے / کھیتوں میں پہنچ گئے سویرے
گوڑی جوتی زمیں کمائی! / نیچے کی زمین اوپر آئی

Scanned by CamScanner

پُرے پانی کسی نے کھینچا — بعضوں نے ڈھیکلی سے کھینچا
برہا کوئی سنبھالتا ہے — نالی کوئی نکالتا ہے
کھیتی پہ نثار ہونے والے — وہ جوتنے بونے والے
پانی کھیتوں میں بھر چکے وہ — جو کچھ کرنا تھا کر چکے وہ

مثنوی بہار اردو کی پہلی مثنوی ہے جس میں کسان کا خوشحال ہونا ضروری سمجھا گیا ہے۔ ورنہ برق کے دور کے جاگیردانہ نظام میں تو اس کی مٹی پلید تھی یہ اشعار آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

گھبرا نہ کسان ہے خدا ساتھ — اللہ کے ہیں بڑے بڑے ہاتھ
دنیا کا رفیق تو ہے دہقاں — عالم کا شفیق تو ہے دہقاں
مفلس قلاش بھوکے محتاج — زردار امیر صاحبِ تاج
سب کا ہے تو نے پیٹ پالا — تیرا ہو جہاں میں بول بالا
تری فیاضیاں ہیں مشہور — کیوں کر نہ ہوں تجھ پہ مغرور
یارب برسا دے ابرِ رحمت — لگ جائے ٹھکانے اس کی محنت
نیت میں ہو پھل جنابِ باری — محنت ہو سپھل جناب باری
ٹھنڈے جھونکے چلیں خدایا — شاخیں پھولیں پھلیں خدایا
ہاں جوشِ نمو بڑھے الٰہی — یہ بیل منڈھے چڑھے الٰہی
پودے جو نہال ہوں تو بن جائے — دہقاں خوشحال ہوں تو بن جائے
اے ابر کنوں پہ جوش دکھا — اے رحمتِ حق بجوش دکھا

گاڑھی ہے کسان کی کمائی
باشد کہ برد کرم نمائی

برق کو بیانیہ شاعری پر قدرت حاصل تھی۔ ان ذیل کے اشعار میں برسات کی کیفیت اور اس کے نتیجے میں جنگل کی حالت کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے

خورشید کو بادلوں نے گھیرا — عالم میں چھا گیا اندھیرا
کرنوں سے ہوا لطیف ہو کر — چلنے لگی بن کے باد صرصر
بادل ڈرتے ہوا سے بھاگے — باتیں کرتے ہوا سے بھاگے

میدانوں میں بڑھ کے آ گئے وہ
کہساروں پہ چڑھ کے چھا گئے وہ

ٹکرائے پہاڑ سے کہیں پر
جھلّا کے برس پڑے وہیں پر

اونچی نیچی پہاڑیوں پر
دھاریں گرتی ہیں لڑکھڑا کر

چشمے کہیں شور کر رہے ہیں
نالے کہیں زور کر رہے ہیں

سوتے ہیں اُبل رہے کہیں پر
فوارے اُچھل رہے کہیں پر

نہریں اٹھلاتی جا رہی ہیں!
لہریں موجیں اُڑا رہی ہیں

برسات کے بعد پہاڑوں اور جنگلوں میں جوشِ نمو اور ہریالی کی کیفیت ملاحظہ ہو

سبزے سے ہرا ہے دامنِ کوہ
پھولوں سے بھرا ہے دامنِ کوہ

تختہ ہے چمن کا یا پہاڑی
گملا پھولوں کا ہے کہ جھاڑی

سبزے کا پہاڑ پر یہ انداز
جیسے چہرے پہ سبزۂ آغاز

گھاٹی پھولوں سے رشکِ گلزار
وادی پہ درخت سلسلہ وار

معشوقۂ سبزہ رنگ ہے گھاس
ہر پھول میں ہے دلہن کی بوباس

بیلیں ہیں پڑی ہوئی شجر پر
بندھن واری بندھی ہے در پر

چرتے ہیں ہرن پرے جمائے
پھرتے ہیں کنوتیاں اُٹھائے

مستی میں کلیلیں کر رہے ہیں
میداں میں طرارے بھر رہے ہیں

خدا کی قدرت کے کرشمے ہر طرف عیاں ہیں۔ ہر شے اس کی عبادت میں مصروف ہے۔ اس کی تصویر برقؔ نے بڑے دل کش انداز میں کھینچی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کھوہوں میں چھپے ہوئے ہیں زہاد
دنیا بھولی ہوئی خدا یاد

چپ بیٹھے ہیں دھونیاں رمائے
اللہ سے اپنی لو لگائے

صانع کی دیکھتے ہیں صنعت
اللہ کی دیکھتے ہیں قدرت

ہر شے سے عیاں ہے نور اس کا
ہر رنگ میں ہے ظہور اس کا

جھیلیں دریا، پہاڑ، چشمے
اس کی قدرت کے ہیں کرشمے

مرغانِ چمن سُروں میں گاؤ
توحید کے زمزمے سناؤ

مرغانِ چمن چہک اٹھو تم
گلہائے چمن مہک اٹھو تم

Scanned by CamScanner

بلبل کی زباں پہ قال آئے — پتی پتی کو حال آئے
قدرت کے ہتھکنڈے نرالے — دیکھیں آنکھوں سے آنکھوں والے

بسنت رُت میں حسینوں اور مہ جبینوں کی کیفیت دیکھئے مثنوی کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے۔

آتے ہی بسنت مدھ پر آئیں — شاخیں آموں کی بور لائیں
کوئل کوکی تو آئے بادل — سر پہ گلشن کے چھائے بادل
اوپر چھائی ہوئی گھٹا ہے — نیچے پریوں کا جمگھٹا ہے
شکلیں نکھری ہوئی ہیں سب کی — زلفیں بکھری ہوئی ہیں سب کی
سحر انگڑیوں میں زباں میں جادو — نظروں میں فسوں بیاں میں جادو
مستانی ادا نشیلی آنکھیں — تیکھی چتون رسیلی آنکھیں
بانکی وہ چھب وہ ترچھی چتون — شوخی طراری چلبلا پن
ہنستی پھرتی ہے کوئی تنتی — جوڑا پہنے ہوئے بسنتی
کلیاں چن چن کے توڑتی ہیں — آپس میں شگوفے چھوڑتی ہیں
کھل کھیلی ہیں راگ لا رہی ہیں — مل مل کے بسنت گا رہی ہیں
دنیا تو بہار سے ہے مسرور — ہے برقؔ کا سوزِ دل بدستور
داں دشت و چمن ہرے بھرے ہیں — یاں داغ کہن ہرے بھرے ہیں

گل بے رخ یار زِ خوش نہ باشد
بے یار بہار خوش نہ باشد

مختصر یہ کہ برقؔ لکھنوی ایک بلند پایہ شاعر، زبردست ادیب اور نامور انشار پرداز تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہیں ادبی دنیا نے ایک طرح سے بھلا دیا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے ادبی کارناموں کو ادب دوستوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ اس نامور ادیب و انشار پرداز کی ادبی اور تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں سے لوگ واقف ہو سکیں۔ ●●

منشی احمد علی شوقؔ قدوائی

شوقؔ قدوائی کا تعلق قصبہ جگور ضلع لکھنؤ کے قدوائی خاندان سے تھا اور یہیں وہ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے لیکن پروفیسر عبدالقادر سروری نے شوق قدوائی پر رسالہ زمانہ بابت ستمبر ۱۹۳۲ء میں اپنے مقالے میں دھوکے سے تاریخ پیدائش ۱۸۵۳ء لکھی ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"شوقؔ ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ قصبہ جگور ان کی جائے پیدائش ہے۔"

اردو شاعری کے ایک انتخاب میں بھی جس کے مرتب ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہیں۔ منشی صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۸۵۳ء لکھی ہے جو غلط ہے اس انتخاب میں زور صاحب نے شوقؔ قدوائی کو قصبہ جگور ضلع بارہ بنکی کا باشندہ لکھا ہے حالانکہ جگور کبھی بارہ بنکی میں شامل نہیں رہا۔ تاریخ پیدائش کے سلسلے میں منشی احمد علی شوقؔ کے صاحبزادے شیخ طاہر قدوائی کے بیٹے ڈاکٹر عقیل طاہر قدوائی سے زیادہ معتبر بیان کس کا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں جو منشی احمد علی شوقؔ قدوائی پر قومی زبان (کراچی) بابت دسمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا ہے رقمطراز ہیں۔

"آپ (شوقؔ قدوائی) ۱۸۵۲ء میں اپنے آبائی وطن قصبہ جگور ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔"

آپ کے والد شیخ کاظم علی قیسؔ قدوائی، اودھ کے ایک ممتاز رئیس تھے۔ نواب واجد علی شاہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ شعر و سخن میں وہ (کاظم علی قیسؔ) میر علی اوسط رشکؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ مولانا احسن مارہروی نے نظم لطیف

میں منشی صاحب کے والد کا نام شیخ اسد علی قدوائی لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے
اُردو کے پرانے تذکروں میں قیس کا کلام کہیں کہیں نظر آجاتا ہے سراپا سخن
از محسن علی محسن سے اُن کی دو غزلیں نقل کی جاتی ہیں۔

کس درجہ اوج پر ہے مرے یار کا دماغ — ہے ساتویں فلک پہ ستم گار کا دماغ
ہوتا ہے درد سر اُسے صندل کے نام سے — کتنا ضعیف ہے ترے بیمار کا دماغ
دشوار قیس سے ترے دیوان کا جواب — پایا کسی نے کب ترے اشعار کا دماغ

دیگر

ہجر خوباں میں بہاتی ہیں جو دریا آنکھیں — کیا ہوئی تھیں اسی دن کیلئے پیدا آنکھیں
دشت غربت میں نہ کس طرح ہوں طوفاں انگیز — کثرتِ گریہ سے ہیں غیرتِ دریا آنکھیں
شعلہ رویوں کا تجسس اُسے کیونکر نہ رہے — دل پُر داغ ہے داغوں سے سراپا آنکھیں
خواہشِ دید ہے انکو نہ تمنائے وصال — رکھتیں ہیں پیشِ نظر یار کا نقشا آنکھیں

چھوڑ کر کوئے محبت کو کہاں جاؤں قیس
اور کوچے سے نہیں میری شناسا آنکھیں

شیخ کاظم علی قیس قدوائی نے تیس سال کی عمر پا کر ۱۸۵۵ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت شوق قدوائی کی عمر ڈھائی سال تھی۔ ان کی پرورش اور تعلیم کا سارا بار اُن کی والدہ کے کمزور کاندھوں پر پڑ گیا۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم آپ نے عربی فارسی کے جید عالم مولوی عبدالغنی موہانی سے حاصل کی جو اس وقت لکھنؤ ہی میں قیام پذیر تھے۔ آپ کی والدہ نے شوق قدوائی اور اُن کے بھائی آبر قدوائی کو تعلیم دلانے کے لئے شیخ امیرالزماں صدیقی کے سپرد کر دیا جنھیں شوق قدوائی کی بہن بیاہی تھیں۔ ملازمت کے سلسلے میں آپ کے بہنوئی کا قیام بدایوں، اُناؤ اور رام پور میں رہا۔ اس طرح اِن تینوں ادبی مرکزوں میں شوق نے تعلیم حاصل کی۔ بدایوں میں آپ نے مولانا ریاض الحسن صاحب سے علوم عربیہ کی تکمیل کی اور گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں انٹرنس تک تعلیم حاصل کی۔ علامہ کیفی دتاتریہ خمخانہ جاوید جلد پنجم میں دھوکے سے یہ لکھ دیا ہے کہ

" سہسوان میں جناب شوق قدوائی نے مولانا ریاض الحسن مرحوم سے علوم عربیہ

کی تحصیل کی اور وہیں انٹرنس تک انگریزی تعلیم پڑھی۔"

بدایوں میں شعر و شاعری کا چرچا دیکھ کر آپ شاعری کی طرف مائل ہوئے زمانہ جنوری ۱۹۱۱ء میں شوق قدوائی رقمطراز ہیں:

"میں بدایوں کے ہائی اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ وہاں شعر و شاعری کا چرچا دیکھ کر دل اس کی طرف مائل ہوا۔ کچھ دنوں بعد میں اپنے وطن اودھ کو آیا۔ لکھنؤ میں تدبیر الدولہ حضرت آسیر مرحوم کا شاگرد ہوا۔ شوق کے ساتھ مشقِ سخن بڑھتی گئی مشق کے بڑھنے پر اس وقت کا مذاق دیکھ کر میں نے ایک مثنوی تصنیف کی جس کا نام ترانۂ شوق ہے۔"

ابھی یہ ہائی اسکول بدایوں میں انٹرنس میں تعلیم حاصل کر ہی رہے تھے کہ اُن کی والدہ نے انھیں جگور بلا لیا۔ اس وقت اُن کی عمر اٹھارہ سال کی تھی جگور آکر اُنہوں نے اپنے چچا شیخ ناظم علی قدوائی کے خلاف تقسیم جائیداد کا مقدمہ دائر کر دیا۔ کیونکہ اُن کے چچا نے جائیداد کا بہت سا حصّہ فروخت کر دیا تھا مقدمے کے سلسلے میں اُن کا شہر لکھنؤ میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ لکھنؤ کے قیام کے دوران اُنہوں نے پانچ سات مہینے مہاراجہ اجودھیا کے یہاں ملازمت کی۔ لیکن اس سے مستعفی ہو کر پھر مقدمے کی پیروی اور جائیداد کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں لکھنؤ ہی میں وہ منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔ اور غزل گوئی سے شاعری کی ابتدا کی لیکن چند ہی برس بعد غزل سے طبیعت ہٹ گئی۔ چنانچہ اپنے خود نوشت حالات میں وہ رقمطراز ہیں:

"غزلوں کے دیوانوں سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ میری مشقِ سخن کا ابتدائی زمانہ ضرور غزل سرائی ہی سے شروع ہوا مگر مشقِ سخن کے بڑھ جانے پر میرا دل غزل کی جانب سے ہٹ گیا۔"

اسیر سے شوق قدوائی کو بڑی عقیدت تھی۔ اسیر کے علاوہ انھوں نے کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔ ڈاکٹر زور نے اردو شاعری کے انتخاب میں کسی غلط فہمی کی بنا پر یہ لکھ دیا ہے کہ رشید سے مشورۂ سخن کیا۔ ترانۂ شوق میں

Scanned by CamScanner

شوقؔ قدوائی فرماتے ہیں ؎

جتنی میرے سخن کی ہے دھوم سب ہے فیضِ اسیرؔ مرحوم

ایک غزل کے مقطع میں بھی اُنھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے ؎

قلمرِو سخن کی ہر زمیں پر ہوں حکمراں

یہ میرا زورِ شوقؔ فیضِ حضرتِ اسیرؔ ہے

لکھنؤ سے شوقؔ قدوائی نے ایک ہفتہ وار اخبار 'آزاد' نکالا تھا اس میں سیاسی مواد سے زیادہ علمی اور ادبی مواد ہوتا تھا۔ "یادِ رفتگاں" میں سید سلیمان ندوی اس اخبار کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"اس عہد کے معزز و مشہور اخباروں میں تھا اور 'زمانہ' کے ادبا کا مظہرِ خیال تھا اور سرسید کی تحریکات سے کافی ہمدردی رکھتا تھا۔"

علمی اور ادبی حلقوں میں یہ اخبار بہت مقبول رہا۔ لیکن مالی اعتبار سے یہ اخبار کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اس لئے آپ نے اسے بند کر دیا۔ اخبار کے بند ہو جانے پر مہاراجہ صاحب پرتاپ گڑھ نے آپ کو اپنی ریاست میں نائب دیوان ریاست کے عہدے پر فائز کر دیا۔ مہاراجہ آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ لیکن آپ کی طبیعت یہاں بھی نہیں لگی اور ملازمت کو خیرباد کہہ کے لکھنؤ آگئے اور پریس خرید کر دوبارہ 'آزاد' اخبار کے اجرا کی کوشش کی اور کامیاب رہے۔

شوقؔ کی زندگی کے تقریباً بیس سال یعنی ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۰ء تک لکھنؤ ہی میں گزرے۔ آپ کے پھوپھی زاد بھائی منشی امتیاز علی ریاست بھوپال میں وزیر تھے انھوں نے ۱۸۹۲ء میں اُنہیں بھوپال بلا لیا اور ریاست میں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا۔ بھوپال میں بائیس سال تک ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز رہ کر انھوں نے نہایت دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ستر کھ ضلع بارہ بنکی میں ایک مکان تعمیر کرایا۔ کیونکہ زندگی کا باقی حصہ یہیں گزارنا طے پایا تھا۔ اس اثنار میں نواب رام پور نے آپ کو رام پور بلا لیا اور کتب خانہ رام پور کی تدوین اور جامع اللغات کی ترتیب کا کام سپرد کیا۔ رام پور میں آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ جامع اللغات کی ترتیب اور تلامذہ کی اصلاح میں گزرتا تھا

قیامِ رام پور ہی میں انھوں نے اردو کی وہ شاہکار نظمیں لکھیں جو جدید شاعری میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نواب حامد علی خاں والیٔ رام پور کسی وجہ سے اُن کے بھتیجے صفدر قدوائی سے ناراض ہو گئے تھے۔ اس لئے شوقؔ قدوائی اور آبر قدوائی دونوں بھائیوں نے رام پور کو چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا۔ یہاں کی ملازمت سے مستعفی ہو کر شوقؔ قدوائی سترکھ ضلع بارہ بنکی میں گوشہ نشین ہو گئے کیونکہ اب اُن کی عمر ستّر سال سے تجاوز کر چکی تھی۔

شوقؔ نے اپنی زندگی کے آخری دو سال سترکھ ہی میں گزارے۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں استسقا کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور علاج کے لئے اپنے داماد رضی الدین احمد بیرسٹر کے یہاں گونڈہ تشریف لے گئے۔ لیکن علاج سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ کیونکہ مرض موت کا پیغام بن کر آیا تھا۔ آخر ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء کو گونڈہ ہی میں انتقال کیا۔ اور یہیں دفن ہوئے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر زور کے نزدیک آپ کا سالِ وفات ۱۹۲۸ء ہے۔ جو غلط ہے۔

نذرِ عرشی میں جس کے مرتبین مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین احمد ہیں۔ ایک مقالہ "کتب خانہ رضائیہ — مختصر تعارف" کے عنوان سے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا شامل ہے۔ اس میں عابد رضا بیدار اُن کی تاریخِ وفات کے سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

"اُن کا انتقال ۹ دسمبر ۱۹۲۳ء میں ہوا ویسے اُنہیں طویل علالت کے سبب ملازمت سے اس سے پہلے ہی سبکدوش کر دیا گیا تھا۔"

یہ دونوں سنین صحیح نہیں ہیں۔ جیسا کہ اردو کے بیسیوں ادیبوں اور شاعروں کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ شوقؔ قدوائی کے تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات کے سلسلے میں بھی اردو کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں واضح اختلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا شوقؔ قدوائی نے ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء کو گونڈہ میں وفات پائی اور گونڈہ ہی میں اُن کا مزار ہے۔ لوحِ مزار پر اُن کی تاریخِ وفات ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء کندہ ہے۔ اُن کے پوتے ڈاکٹر عقیل طاہر قدوائی نے بھی ان کی وفات کے سلسلے میں لکھا ہے — "آخر ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء کو اُردو کا یہ مایۂ ناز شاعر اور ادیب راہیِ ملکِ عدم ہوا۔"

Scanned by CamScanner

منشی احمد علی شوق قدوائی کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ جن ممتاز شخصیتوں نے آپ سے مشورہ سخن کیا اُن میں مولانا محوی صدیقی، جگر بریلوی اور مولانا راغب بدایونی قابلِ ذکر ہیں۔

شوق قدوائی کی جملہ مطبوعہ تصانیف میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں۔ اُن کے بارے میں مختصراً ذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔

(۱) ترانۂ شوق ۔ یہ شوق قدوائی کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۸۸۷ء میں اور تیسرا اڈیشن ۱۹۱۱ء میں چھپا تھا۔ ترانۂ شوق مثنوی گلزارِ نسیم کی بحر میں اور نسیم لکھنوی کے رنگ و تتبع میں لکھی گئی ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اس مثنوی کے سلسلے میں رسالہ 'زمانہ' ستمبر ۱۹۳۲ء میں رقم طراز ہیں۔

"ترانۂ شوق کا مطمحِ نظر مثنوی گلزارِ نسیم ہے۔ اسلوب دونوں کا ایک سا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ گلزارِ نسیم میں صناعی زیادہ ہے۔ قصہ کے اعتبار سے ترانہ بہت ہی ناقص اور پیچیدہ ہے۔"

شوق قدوائی اپنے خود نوشت حالات میں اس مثنوی کے سلسلے میں لکھتے ہیں "میری سب سے پہلی تصنیف ترانۂ شوق ہے۔ میری تصنیفات میں یہی ایک کتاب ایشیائی مذاق اور اردو شاعری کے پچھلے رنگ کی ہے۔ اس کے بعد کی جتنی تصنیفات ہیں سب نئے مذاق اور نئی شاعری کی ہیں۔ میری سمجھ میں ملک نے ترانۂ شوق کی ابھی قدر نہیں کی۔

(۲) مسدس بیل و نہار۔ مسدس شوق قدوائی نے ۱۸۸۹ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں پڑھا تھا اور سرسید مرحوم کی نذر کیا تھا۔ اس کے کئی اڈیشن علی گڑھ ہی سے شائع ہوئے ہیں۔ آخری اڈیشن ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ سے طبع ہوا۔ اگرچہ اس مسدس کی کوئی ادبی حیثیت نہیں پھر بھی اس کی ایک تاریخی اور قومی حیثیت ہے۔

(۳) جمیلہ۔ شوق قدوائی کا یہ ڈرامہ ایک زمانے میں بہت مقبول ہوا تھا اسے بابو گنیشی لال نے لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ اب بھی یہ ڈرامہ اسٹیج پر کھیلا جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

(۴) حسن۔ اس مثنوی کو سب سے پہلے منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ نے کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ اس کے متعلق شوق قدوائی اپنے خود نوشت حالات میں رقم طراز ہیں۔

"پھر میں نے ایک مثنوی حسن لکھی۔ اس میں بیکن اور ٹنکن وغیرہ حکمار کی فلسفیانہ بحثوں کا اخذ ہے جو بیوٹی (حسن) پر انھوں نے کی ہیں۔ اس کو پہلے منشی سجاد حسین صاحب مالک اودھ پنچ نے کتابی شکل میں چھاپا تھا اور اب میری نظر ثانی کے بعد دہلی سے مخزن میں پوری شائع ہوئی ہے۔"

(۵) قاسم اور زہرہ۔ شوق قدوائی کا یہ منظوم ڈرامہ ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے مضمون شوق قدوائی مطبوعہ رسالہ زمانہ دسمبر ۱۹۲۲ء میں غلط فہمی کی بنا پر لکھ دیا ہے کہ قاسم زہرہ کے نام سے انھوں نے ۱۹۱۵ء میں ایک منظوم ڈرامہ بھی لکھا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ڈرامہ الناظر پریس لکھنؤ سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اپنے خود نوشت حالات میں شوق قدوائی نے اسے اپنی تصانیف میں سب سے بہتر تصنیف بتایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "غالباً اردو کی نظموں میں یہ اپنے رنگ کی پہلی کتاب ہے۔ انگریزی قصوں کی طرز کا ایک اوریجنل قصہ ہے۔۔۔۔ سوا تیرہ سو اشعار سے زیادہ ہیں۔ اوّل سے آخر تک اضافت کہیں نہیں ہے۔ سیدھی سادی اردو ہے۔ جس کو فصیح بامحاورہ اور لطیف بنانے کے واسطے میں نے اپنی زبان اور شاعری کی قوت بہت صرف کر دی ہے۔"

(۶) دُرِّ یتیم۔ منشی محمد امیر صاحب مارہروی نے جو شوق قدوائی کے دوست تھے۔ یہ نظم کتابی شکل میں ۱۹۱۱ء میں مارہرہ ہی سے طبع کرائی تھی۔ یہ اُن کی اچھی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔

(۷) سائنس اینڈ ریلیجن۔ (علم حکمت اور مذہب) اسے شوق قدوائی نے اپنے عزیز ترین دوست سر سلیمان کی فرمائش سے نظم کیا تھا۔ یہ کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ اس میں سائنس اور مذہب کے پیچیدہ اور دقیق مسائل نہایت شگفتہ انداز میں نظم کئے گئے ہیں۔

(۸) گنجینہ۔ یہ شوق قدوائی کی مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں حسن

Scanned by CamScanner

بھار، برسات اور طبعیات اور مذھب کے عنوان سے مثنویاں شامل ہیں۔
اس مجموعہ پر منشی جوالہ پرشاد برق کا مقدمہ فلسفۂ حسن کے موضوع پر ہے اور خود مصنف نے فلسفۂ حسن پر حکمائے عالم کے اقوال فٹ نوٹ کے طور پر لکھے ہیں۔ اس مجموعے کو نیرنگ رام پور کے اڈیٹر منشی سعید اللہ خاں عاشق مرحوم کے صاحبزادے منشی عزیز اللہ خاں نے مطبع سعیدی رام پور سے اکتوبر ۱۹۱۹ء میں شائع کرایا تھا۔ اس مجموعہ کی مثنویاں فلسفیانہ رنگ لئے ہوئے ہیں۔

(۹) فیضانِ شوق۔ یہ شوق قدوائی کی غزلوں، رباعیوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ فیضانِ شوق میں اُن کی تمام غزلیات کو شامل کرلیا گیا ہے۔ غزل گوئی میں وہ قدما کے پیرو تھے۔ ان کی غزلوں میں روزمرہ، محاورہ اور لطفِ زبان کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ بحیثیت غزل گو ان کا اردو شاعری میں کوئی مقام نہیں۔ یہ مجموعہ خان بہادر شیخ رضی الدین احمد بیرسٹر گونڈہ نے ۱۹۲۸ء میں عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ مقبول المطابع گونڈہ سے چھپوایا تھا۔

(۱۰) عالمِ خیال۔ یہ نظم پہلی بار ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مصنف کی زندگی ہی میں دو اڈیشن اور شائع ہوئے۔ پھر ۱۹۲۵ء میں اس کا ایک ترمیم شدہ اڈیشن میتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ میں چھپا۔ بقول سر سلیمان اس نظم میں "عورت کا دل مرد کا قلم بن کر بول رہا ہے۔ عالمِ خیال کے مقابلے میں اردو کی صرف ایک مثنوی انتظار پیش کی جاسکتی ہے۔ علامہ کیفی نے خمخانۂ جاوید جلد پنجم میں لکھا ہے کہ عالمِ خیال پر آپ کے دوست اور مداح منشی جوالا پرشاد برق نے نہایت عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔ برق کا کوئی مقدمہ اس کتاب کے ساتھ شائع نہیں ہوا ہے۔ بلکہ شوق کی مثنویوں کے مجموعے گنجینہ پر فلسفۂ حسن کے موضوع پر برق نے ایک مقدمہ لکھا تھا۔
منشی احمد علی شوق کے پندرہ ادبی خطوط بھی میرے پاس محفوظ ہیں ایک خط جو حضرت جگر بریلوی کے نام ہے ملاحظہ کیجئے۔

موتی مسجد۔ رام پور اسٹیٹ یوپی
۲۴ اپریل ۱۹۲۴ء
بندہ نواز میں نے رازِ فغاں کے قافیہ کو نہ خیال کیا ہوگا۔ سہو سے

لکھ گیا۔ آپ اپنا اصلی شعر رہنے دیجئے وہ صحیح ہے۔

ٹیپ کا لفظ اب فصحا میں متروک ہے نہ کوئی بولتا ہے نہ کہتا ہے ٹیپ بازاریوں کے محاورے میں چپت کے معنی میں بولتے ہیں۔ اب بند کے آخری شعر کو بیت کہتے ہیں۔ یہ بات میں نے احتیاطاً لکھ دی ہے۔

بند کی بیت جو آپ نے لکھی ہے یعنی دن کو رہتا ہے الخ وہ صحیح ہے۔ کوئی نقص اس میں نہیں ہے۔

عالم خیال کے طبع میں ابھی دیر ہے۔

احمد علی شوق قدوائی۔

نظر لکھنوی، عزیز لکھنوی، چکبست، شوق قدوائی، یگانہ اور صفی دبستان لکھنؤ کے اس آخری دور کے شاعر تھے جب شمع محفل تو گل ہو چکی تھی لیکن اس کے پروانوں کی خاک جا بجا نظر آ جاتی تھی۔ شوق قدوائی، عزیز، صفی، نظر، یگانہ اور چکبست کی طرح مشاق اور پرگو شاعر تھے لیکن جہاں تک اردو غزل کا سوال ہے ان کا ان اساتذۂ سخن کے سامنے کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ البتہ ہندوستانی ماحول و جذبات کے وسیع نقشے شوق قدوائی نے کھینچے ہیں وہ اردو ادب میں خاصہ کی چیز ہیں۔ اور یگانہ، عزیز، نظر، صفی اور چکبست اس صنف میں شوق قدوائی سے بہت پیچھے نظر آتے ہیں۔

حسن کے عنوان سے شوق قدوائی کی ایک طویل نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے حسن کی تعریف اور حسن کے جو پہلو ظاہر یا مستور ہیں ان پر نہایت کامیابی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

اللہ رے حسن تیرے نیرنگ	تو جس میں ہو لاتی ہے وہ شے رنگ
گلشن کی ہوا ہے پیام تیرا	پھولوں میں بہار نام تیرا
پردے سے خزاں کے تنگ ہو کر	باہر نکلا جو دنگ ہو کر
کی تو نے نگاہ کے بہ طرف گشت	گلکاری صحن گلشن و دشت
سبزی، سبزے کی خوبی تجھ سے	رنگت پانی ہے دوپ تجھ سے
سرخی سے چمن میں درد ہے تو	سرسوں پھولے تو زرد ہے تو

دھانوں میں ترا لباس دھانی ‍ ‍ السی پھولے تو آسمانی
تو نخل کے قد سے تن کے پیدا ‍ ‍ تو شاخ سے لوچ بن کے پیدا

"بہار" پر شوق قدوائی کی نظم بہت مقبول ہے۔ اس نظم میں مشاہدے کی خوبی قابلِ داد ہے۔ نظم میں عمق اور گہرائی بھی پائی جاتی ہے جو اُن کے دور کے شعراء کے یہاں نظر نہیں آتی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پپیہے کو کہیں کوئل سے ہے بحثِ ہم آوازی
کہیں ہے کوکلا کس حسن سے محو نواسازی
کہیں ہے نغمہ زا بلبل کہیں شاما کہیں ادھیر
کہیں چنڈول اڑتا اور گاتا ہے بلندی پر
کسی جا طوطیِ خوش لہجہ کی شیریں بیانی ہے
کہیں چھوٹا شورا مائلِ رنگیں بیانی ہے
کہیں بھنگراج دل کو کھینچتا ہے خوش نوائی سے
کہیں مینائیں غل کرتی ہیں آپس کی لڑائی سے
ہزاروں رنگ کی چڑیاں ہیں شکلیں خوشنما جن کی
ادائیں دلربا جن کی صدائیں نغمہ زا جن کی
بہار آنے سے خوش ہیں ہر طرف اتراتی پھرتی ہیں
ہوا تو ناچتی پھرتی ہے چڑیاں گاتی پھرتی ہیں

اردو شاعری میں صنفِ لطیف کے نازک اور شیریں جذبات کو سرور جہاں آبادی جگر بریلوی اور شوق قدوائی نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ورنہ عام طور سے اردو شاعروں نے صنفِ لطیف کے جذبات کی بڑی ڈراؤنی اور مضحکہ خیز تصویر کھینچی ہے۔ شوق قدوائی کی نظم "عالمِ خیال" نسوانی جذبات کی ایک مکمل تصویر ہے۔ بقول سر سلیمان اس نظم میں عورت کا دل، مرد کا قلم بن کر بول رہا ہے۔ عورت کے دل میں اس کے خاوند کے نہ آنے پر جو جذبات پیدا ہو سکتے ہیں اُن کو ملاحظہ فرمائیے۔

خط سے بڑی جگر پہ چوٹ داغ ہرے ہوئے ہیں آج

Scanned by CamScanner

تم سے ہزار ہا گلے دل میں بھرے ہوئے ہیں آج

خط ہے تمہارے ہاتھ کا پڑھتی ہوں اس کو بار بار

کھولتی ہوں ہزار بار چومتی ہوں ہزار بار

جن سے لکھا گیا ہے خط کاش وہ انگلیاں ملیں

میرا خیال چوم لے جا کے وہیں جہاں ملیں

خود بھی گئے تم اور چین چھین کے مجھ سے لے گئے

مجھ کو سٹرن بنا گئے مجھ کو جنون دے گئے

سب کے جگر میں خون ہے میرے جگر میں درد ہے

سب کا شباب لال ہے میرا شباب زرد ہے

ایک تمہیں تھے میرا عیش بن گئے غم تو کیا کروں

پہلے تمہیں تھے میرا چین اب ہو ستم تو کیا کروں

تم نہ ستم کرو تو کیوں دل میرا بے قرار ہو

میں نہیں چاہتی کہ تم میرے گناہگار ہو

کیا میں خدا کے سامنے تم کو سزا دلاؤں گی

اپنی وفا کے نام کو خاک میں کیوں ملاؤں گی

برسات اور بہار پر مولانا حالی، اسمٰعیل میرٹھی، برق لکھنوی، جگر بریلوی اور اردو کے دوسرے شعراء نے نظمیں لکھی ہیں۔ اگر اُن کا ایک مجموعہ شائع کر دیا جائے تو اردو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی برسات اور بہار پر اس سے بہتر نظموں کا مجموعہ شاید نہیں مل سکے گا۔ شوق قدوائی نے برسات اور بہار پر پانچ سات نظمیں لکھی ہیں۔ برسات کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیے۔

ہو چلے تالاب لبریز اور نہریں بھر چلیں
ندیاں اپنی حدوں سے بڑھ کے قبضہ کر چلیں

پیچ و خم کے ساتھ بہنے سے کھلا مستی کا حال
ندیاں چلتی ہیں میدانوں میں متوالوں کی چال

کس لئے غصہ کی حالت ان پہ طاری ہو گئی
کف لبوں پر آ گیا آواز بھاری ہو گئی

کیوں بھنور چکر میں ہے موجوں کو کیوں ہے پیچ و تاب
کیوں غضب کے جوش میں آنکھیں دکھاتے ہیں حباب

مفت پا کر کی زمیں نے ابر کی دولت تلف
کس قدر گھلی ہوئی چاندی بہائی ہر طرف

ندیوں کو لے کے یوں دریا سمندر سے ملے | لے کے ارمانوں کو عاشق جیسے دلبر سے ملے
جنگل کی رات" میں شوق نے کیا حقیقت نگاری کی ہے۔

جنگل کی اندھیری رات سنسان | بادل میں گھرا ہوا پریشان
جھونکوں میں غضب کی سنسناہٹ | شاخوں میں رگڑ بلا کی آہٹ
پیڑوں کا وہ ہولناک انداز | شیروں کی وہ خوفناک آواز
شعلوں کا وہ خود بخود بھڑکنا | پتوں کا وہ جا بجا کھڑکنا
وہ بوم کا ہو وہ ہو کا عالم | وہ وہم کی صورت مجسم!
اُو حسن وہاں بھی جلوہ گر تو | جگنو بن کر اِدھر اُدھر تو

بادل کے پھٹنے کا منظر ملاحظہ فرمائیے۔

وہ ہوا نے زور باندھا اور بادل پھٹ گیا
کھل گیا خورشید کا چہرا کہ پردہ ہٹ گیا
بچھ گیا ہے دھوپ سے سونے کا پتر ہر طرف
خوب برساتی ہیں کرنیں ہُن زمیں پر ہر طرف
صحن سونے کا ہے چھت سونے کی گھر سونے کے ہیں
پھول پھل پتے ہیں سونے کے شجر سونے کے ہیں
کیمیا گر ہے مگر عالم میں خورشیدِ فلک
جس کی صنعت سے پہاڑوں میں ہے سونے کی چمک
مختلف چڑیاں اُڑیں کوے اُڑے چیلیں اڑیں
اپنے اپنے آشیانے سے ابابیلیں اڑیں!
بھوک سے ہیں سب پرندے اور چرندے بے حواس
ڈھونڈتا ہے کوئی کیڑے کوئی پھل اور کوئی گھاس
ہے نرالی سب سے خرگوشوں کے چلنے کی ادا
کیا بھلی معلوم ہوتی ہے اچھلنے کی ادا
سبز میدانوں میں پھرتے ہیں ہرن چرتے ہوئے
دیکھ لیتے ہیں مگر چاروں طرف ڈرتے ہوئے

Scanned by CamScanner

آخر میں ایک چھوٹی سی نظم "لطفِ سحر" بھی پڑھ لیجیے۔

وہ دن کے لئے سرور کا وقت — وہ لطفِ سحر وہ نور کا وقت

آہستہ نسیم کا وہ چلنا — سورج کا وہ آڑ سے نکلنا

شفاف وہ آبجو چمن کی — بھینی بھینی وہ بو چمن کی

منہ پھولوں کے دھو گئی ہے شبنم — سبزے کو بھگو گئی ہے شبنم

نوکوں پہ جو قطرے تھم گئے ہیں — دانے موتی کے جم گئے ہیں

کلیوں سے لکیر سی ہویدا — کچھ قصدِ تبسم ان سے پیدا

دل کو جو لبھایا رنگ و بو نے — اور حسن کشش یہ دی ہے تو نے

●●

Scanned by CamScanner

پنڈت برج نرائن چکبست

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت اودت نرائن چکبست فیض آباد سے ترک وطن کر کے ۱۸۹۱ء میں لکھنؤ چلے آئے۔ اور کشمیری محلہ میں پنڈت تربوکی ناتھ کول بیرہ پنڈت دیا شنکر نسیم مرحوم کے مکان کے سامنے ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ آپ کے والد پنڈت اُودت نرائن چکبست اُردو کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ایک شعر اُن کا ملاحظہ فرمایئے۔

اللہ اللہ رے اثر نالوں کا تیرے بلبل
پردۂ غیب سے گل چاک گریباں نکلا

پنڈت برج نرائن چکبست نے کشمیری محلہ لکھنؤ ہی میں نشوونما پائی۔ والد کا سایہ عاطفت طفولیت میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اس لئے چکبست مرحوم نے اپنے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست ایگزیکیوٹو افیسر لکھنؤ میونسپلٹی کے زیرِ سایہ تعلیم و تربیت پائی تھی۔ بچپن سے ہی چکبست نے شاعر کا دل و دماغ اور مصور کی نگاہ پائی تھی۔ انہیں نو یا دس سال کی عمر سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور ۱۸۹۴ء میں اپنی پہلی غزل کشمیری سوشل کانفرنس میں گیارہ برس کی عمر میں پڑھی تھی۔ غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب قومی کا زباں پر ان دنوں افسانہ ہے	بادۂ الفت سے پُر دل کا مرے پیمانہ ہے
جس جگہ دیکھو محبت کا وہاں افسانہ ہے	عشق میں اپنے وطن کے ہر بشر دیوانہ ہے
جب کہ یہ آغاز ہے انجام کا کیا پوچھنا	بادۂ الفت کا یہ تو پہلا ہی پیمانہ ہے

دل فدا ہر اک کا اس پر صورتِ پروانہ ہے ؎ ہے جو روشن بزم میں قومی ترقی کا چراغ
دشمنی نا اتفاقی سبزۂ بیگانہ ہے ؎ ہے گلِ مقصود سے پر گلشنِ کشمیر آج

یہ محبت کی بنا قائم ہوئی ہے آپ سے
آپ کا لازم صمیمِ دل سے ہمیں شکرانہ ہے

لالہ سری رام ایم۔ اے مؤلف "خمخانہ جاوید" کو ایک خط میں سوانحی حالات دریافت کرنے کے سلسلے میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا۔

"جناب والا تسلیم! آپ نیاز مند کے سوانحی حالات دریافت کرتے ہیں حیران ہوں کہ کیا لکھوں۔ اول تو میں باضابطہ شاعر ہی نہیں تخلص کا بھی گنہگار نہیں ہوں چکبست میرا عرف ہے نہ کہ تخلص۔ سولہ سترہ برس سے شعر و سخن کا مذاق ضرور ہے لیکن ایک دیوان بھی تیار نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں مجھے باضابطہ شاعروں کے زمرے میں داخل کرنا ہی بیکار ہے۔ مگر خیر مجبوئے تو میرا نام آ ہی گیا۔ اب آپ کو زندگی کے حالات کیا لکھوں۔ لکھنؤ وطن ہے۔ عمر تقریباً ۲۸ سال ہے۔ اپنے دوستوں کا دل بہلانے کو کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ پرانے رنگ کی شاعری یعنی غزل گوئی سے نا آشنا ہوں لیکن اس کے ساتھ میرا عقیدہ یہ ہے کہ محض نئے خیالات کو توڑ مروڑ کر نظم کر دینا شاعری نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق خیالات کی تازگی کے ساتھ زبان میں شاعرانہ لطافت اور الفاظ میں تاثیر کا جوہر ہونا ضروری ہے۔ لیکن میں پھر آپ کو لکھتا ہوں کہ میں قدردانِ سخن ہوں سخنور نہیں۔ جس کا نام شاعری ہے وہ اور ہی چیز ہے جو بہر حال مجھے نصیب نہیں۔"

پنڈت برج نرائن چکبست نے ۱۹۰۴ء میں کشمیری محلہ لکھنؤ میں ایک کلب قائم کیا تھا۔ اس کلب کا خاص مقصد کشمیری پنڈت برادری کے جوانوں کی اخلاقی حالت کو سدھارنا تھا۔ یہ کلب ۱۲ سال تک قائم رہا۔ اس کے سالانہ جلسے بڑے شاندار ہوتے تھے۔ اس کلب کا نام انجمن نوجوانان کشمیر تھا۔ اس کلب میں ایک شاندار لائبریری تھی اس لائبریری کا نام شیو نرائن بہار لائبریری تھا اس کلب کے آٹھویں سالانہ جلسے کی صدارت پنڈت بشن نرائن در آبر مرحوم نے فرمائی تھی۔ اور اس جلسے میں حامد علی خاں بیرسٹر اور منشی پریم رائے لطف کو بھی تقریر کرنے کے لئے چکبست نے بلایا تھا۔ پنڈت

Malik ... College

منوہر لال زتشی، پنڈت تیج نرائن ملا اور پنڈت بشن نرائن در آبرہ اس کلب کے برگزیدہ رکن تھے۔ پنڈت امرناتھ شرغا بہار کشمیر لاہور کے "چکبست نمبر" میں فروری ۱۹۳۹ء کے شمارے میں رقم طراز ہیں۔

"ایام جوانی میں ہی جب کہ وہ کالج میں تعلیم پاتے تھے، چکبست صاحب کے دل میں قومی درد بھرا ہوا تھا۔ اور وہ نوجوانانِ قوم جن کو رات دن مے خواری اور فلش وغیرہ کھیلنے کے دوسرا کوئی کام نہ تھا۔ اُن کو افعال ناشائستہ سے بچانے کے لئے انھوں نے کشمیری محلہ لکھنؤ میں ایک کلب کھولا۔ اور اخبار بینی اور رسائل وغیرہ کا شوق نوجوانوں کے دلوں میں پیدا کرنے کے لئے ریڈنگ روم بھی جاری کیا یہ تدبیر ایسی کارگر ہوئی کہ نوجوانانِ قوم کے اخلاقی عمل میں دن بدن فرق پیدا ہونے لگا"

کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۰۵ء میں بی۔اے پاس کیا اور اسی سال "گلزارِ نسیم" کا اڈیشن اپنے دیباچے کے ساتھ شائع کیا۔ اس دیباچہ میں چکبست نے نسیم کی شاعری کا مقابلہ اردو کے دیگر مثنوی نگاروں سے کیا تھا۔ یہ موازنہ چکبست نے نئی امنگ میں آکر لکھا تھا۔ اس لئے مولانا عبد الحلیم شرر نے اس مثنوی کا ریویو کرتے ہوئے اس پر اعتراضات کئے۔ اس ریویو کے بعد معرکہ آرا ادبی مباحثہ ہوا اس میں ہندوستان کے سب ہی اہلِ قلم شریک ہوئے۔ اس ادبی مباحثہ نے چکبست کو سارے ہندوستان میں مشہور کر دیا۔ کیونکہ اس مباحثہ میں مولانا شرر سے چکبست نے لوہا لیا تھا۔ بہ قول فراق گورکھپوری۔

"دنیا جانتی ہے کہ اس معرکہ میں مولانا شرر نے منہ کی کھائی لیکن سوائے چکبست کے اور کسی کا کام بھی نہیں تھا کہ قلم کے اس سورما سے لوہا لے سکے۔"

چکبست نے ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی وکالت میں خوب فروغ ہوا اور اُن کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں ہونے لگا اُن کی ادارت میں صبح امید کے نام سے ایک رسالہ ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ رسالہ شروع میں اعتدال پسند کشمیری فرقہ کا رسالہ تھا۔ لیکن بعد میں اس رسالے کا خاص مقصد ملک میں قومی اور وطنی خیالات کو فروغ دینا تھا۔ بڑے بڑے

Scanned by CamScanner

سیاسی رہنماؤں کے مضامین اس رسالے میں شائع ہوئے ہیں۔ رسالہ صبح امید میں غالب آتش، ناسخ، صفی، نوبت رائے، نظر وغیرہ کے کلام کے منتخب اشعار "عطر سخن" کے عنوان سے شائع ہوتے تھے۔ جولائی واگست ۱۹۱۹ء میں صبح امید کا "رفارم نمبر" شائع ہوا تھا

چکبست ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ میں رائے بریلی تشریف لے گئے عدالت میں بحث ختم ہو جانے کے بعد آپ لکھنؤ لوٹنے لگے۔ اسٹیشن پر آئے۔ ریل میں بیٹھے تھے کہ دماغ پر فالج گرا۔ دوستوں اور احباب نے یہ حالت دیکھ کر آپ کو ویٹنگ روم میں لٹایا اور ڈاکٹروں کو علاج کے لئے لائے مگر سب بے سود۔ انھوں نے سات بجے شام کے وقت ۱۲ فروری کو رائے بریلی کے اسٹیشن ہی پر انتقال فرمایا۔ آپ کے بھائی مہاراج نرائن چکبست آپ کی لاش کو لکھنؤ لائے اور ۱۳ فروری ۱۹۲۶ء کو دریائے گومتی کے کنارے آپ کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ ۴۴ سال کی عمر پائی آپ کا مشہور شعر ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

اسی شعر کے آخری مصرعے سے جناب کاظم حسین محشر لکھنوی نے تاریخ وفات نکالی ہے

ان ہی کے مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

۱۳۴۴ھ

اردو اور ہندی کے بعض ادبی مورخوں نے چکبست مرحوم کو حضرت عشق لکھنوی کا شاگرد لکھ دیا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ چکبست نے سوائے پنڈت بشن نرائن در ابر کے کسی سے شعر و شاعری میں مشورہ سخن نہیں کیا تھا۔ حق بات تو یہ ہے کہ ان کی علمی اور اخلاقی زندگی پنڈت بشن نرائن در ابر کی ذاتِ بابرکات سے وابستہ تھی لڑکپن میں ان کو ایسا خضرِ راہ مل گیا تھا جس کو چکبست کی خوش نصیبی سمجھنا چاہیئے۔ مندرجۂ روحِ نظم میں کیا خوب فرماتے ہیں

مجھ سے یارانِ عدم نے یہ اگر فرمایا
حسرت آبادِ جہاں سے تجھے کیا ہاتھ آیا
میں کہوں گا کہ بس اک رہبرِ کامل پایا
زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایہ

Scanned by CamScanner

لے کے دنیا سے یہی مہر و وفا آیا ہوں
اپنے محسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

حکیم آشفتہ کا ایک مقالہ چکبست کے بارے میں عرصہ ہوا رسالہ "ترچھی نظر" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں آشفتہ مرحوم نے لکھا ہے کہ چکبست آخری وقت تک اپنے مکان کشمیری محلہ میں رہے یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ چکبست وکالت کے سلسلے میں کشمیری محلہ کا مکان چھوڑ کر گولا گنج میں مقیم ہو گئے تھے اور آخر وقت تک اسی مکان میں رہے۔

اردو کے ادبی مورخوں کا خیال ہے کہ چکبست نے "صبح وطن" اور "مضامین چکبست" کے علاوہ کوئی اور معنوی یادگار نہیں چھوڑی۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں چکبست کی تصانیف کی مکمل فہرست ملاحظہ فرمایئے۔ یہ سب کتابیں میری لائبریری میں محفوظ ہیں۔

(۱) گلزارِ نسیم معہ انتخاب دیوانِ نسیم - پنڈت برج نرائن چکبست اس کتاب کے مرتب ہیں۔ اس کا ایک اڈیشن فروری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا جس کے مرتب چکبست ہیں۔ اس کے دیباچے میں چکبست نے نسیم کی شاعری کا موازنہ دیگر مشہور مثنویوں سے کیا تھا۔ گلزارِ نسیم کے اس نئے اڈیشن نے نسیم کی ادبی شہرت میں نئی روح پھونک دی۔

(۲) کملا - یہ پنڈت برج نرائن چکبست کا لکھا ہوا ایک دلچسپ ڈرامہ ہے یہ ڈرامہ پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں جی۔ پی ورما برادران پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ بعد ازاں عطیہ نشاط نے اسے از سر نو اپنے مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا۔ ۱۹۷۱ء میں رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد نے اسے شائع کیا۔ اس ڈرامے کے پلاٹ میں کہیں کہیں خامیاں نظر آتی ہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے رسالہ تذکرۃ الشعرا علی گڑھ حصہ اول کے ۱۹۱۰ء کے شمارے میں اس کتاب پر ریویو ان الفاظ میں کیا ہے "کملا" یعنی اردو زبان کے مشہور انشاپرداز اور شاعر پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کی تازہ تصنیف منشی صادق علی صاحب حکیم گولا گنج شہر لکھنؤ سے ۸۰ر میں مع محصول ڈاک مل سکتی ہے۔ اس ڈرامہ کا پلاٹ خامیوں سے پاک نہیں ہے اور دیہاتی

زبان کا چربہ بھی صحیح نہیں اترا ہے۔ تاہم زبان کی خوبیوں اور افسانے کی دلچسپی میں
شبہ نہیں۔ بہ حیثیت مجموعی کتاب قابلِ دید ہے۔ اگرچہ اس کا مرتبہ مسٹر
چکبست کے مرتبہ تصنیف سے کسی قدر پست ضرور ہے"

(۳) گلدستۂ پنچ۔ یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں ہندوستانی پریس نظیر آباد
لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے یہ کتاب مجموعہ ہے مرحوم اودھ پنچ کے بعض ممتاز
نامہ نگاروں اور اس کے اڈیٹر منشی سجاد حسین مرحوم کے منتخب مضامین کا مع مختصر
حالات زندگی و تصاویر منشی سجاد حسین، میرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت
تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد و منشی جوالا پرشاد برق۔ اس کتاب کا دیباچہ
اور نامہ نگاروں کے حالات چکبست مرحوم کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا
حصہ شائع ہو چکا ہے لیکن دوسرا حصہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

(۴) صبحِ وطن:۔ یہ چکبست کا مجموعہ نظم ہے۔ جو اُن کی وفات کے بعد سر تیج
بہادر سپرو کے فاضلانہ دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا۔ انڈین پریس الہ آباد سے اس کے
دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا اڈیشن ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا ہے اور دوسرا اڈیشن
۱۹۲۶ء میں اور تیسرا ۱۹۲۸ء میں۔ یہ تینوں اڈیشن میری لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان
کا مجموعہ کلام پانچ حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے دوسرے حصہ میں سوائے تین نظموں
کے سب نظمیں وطن پرستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ تیسرے حصہ میں وہ نظمیں ہیں
جن کو احباب و اکابر کا مرثیہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ چوتھا حصہ غزلیات پر اور پانچواں
حصہ اُن کے ابتدائی کلام پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر تاراچند کا ایک مقالہ "یادِ چکبست (مترجمہ
پنڈت آنند نرائن ملا) میں چکبست کی انفرادیت پر شائع ہوا ہے۔ اس میں صبح وطن
کے سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں "چکبست کا مختصر کلام "صبح وطن" کے نام سے اُن کی
وفات کے سال ۱۹۲۶ء میں طبع ہوا۔ اس میں ۳۶ نظمیں ہیں۔ قریب چالیس کے غزلیں
کچھ رباعیاں اور کچھ متفرق اشعار۔ کل جلد ۱۷۷ صفحات پر مشتمل ہے نظموں کی تفصیل
یوں ہے کہ کچھ قومی ہیں جن کا تعلق خاص قومی تحریکوں سے ہے یا جن کا محرک حبِ وطن
کا جذبہ ہے، کچھ مرثیے ہیں۔ جو قومی رہبروں یا اپنے دوستوں کی موت کی یادگار میں لکھے
گئے ہیں۔ کچھ نظمیں قومی اصلاح کی ترغیب کے لئے حیطۂ تحریر میں لائی گئی ہیں، کچھ

Scanned by CamScanner

ہیں اخلاقی خیالات کی ترجمانی ہے اور کچھ میں تاریخی واقعات کی داستان نظم ہے تین چار نظموں میں قدرتی مناظر کی تصویر کھینچی ہے اور ایک میں لکھنؤ کے امام باڑے کا بیان ہے۔ کلام میں نظموں کا حصّہ ہی غالب ہے۔"

(۵) مضامین چکبست۔ یہ چکبست کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے انڈین پریس الہ آباد نے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔ چکبست کے ایک عزیز دوست پنڈت اقبال کشن درنے دھوکے سے "بہارِ کشمیر کے چکبست نمبر" میں لکھ دیا تھا کہ "مضامین چکبست جو مختلف رسالوں اور اخبارات سے مہیا ہو سکے انھیں انڈین پریس الہ آباد نے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا"۔ مضامینِ چکبست کا ۱۹۲۸ء میں کوئی اڈیشن شائع نہیں ہوا۔ البتہ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۲۷ء میں ضرور شائع ہوا۔ اور تیسرا اڈیشن ۱۹۵۵ء میں۔ تاریخی حیثیت سے دیکھئے تو اس مجموعہ کا پہلا مضمون ۱۹۰۳ء کا لکھا ہوا ہے جو پنڈت دیا شنکر نسیم پر ہے اور آخری مضمون ۱۹۲۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ جس کا موضوع اردو شاعری ہے

چکبست کے اندازِ تحریر کے بارے میں جگر بریلوی اپنی کتاب یادِ رفتگاں میں رقم طراز ہیں۔

شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت اعلیٰ پایہ کے ادیب و انشا پرداز بھی تھے آپ کے مضامین نثر آپ کی حیات ہی میں چھپ کر شائع ہو گئے تھے۔ یہ مضامین زیادہ تر مشاہیر مصنفین کے حالات اور اُن کے کلام پر تبصرہ سے متعلق ہیں۔ ایک مضمون تاریخ پر ہے۔ ایک ذات کی تفریق پر۔ مصنف نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے شرح و بسط کے ساتھ اس پر بحث کی ہے۔ اس کے ساتھ آپ کا انداز جامع اور مانع بھی ہے۔ یہ بڑی خوبی ہے کہ موضوع کی مناسبت سے عبارت کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ شعرا و مصنفین کا ذکر شگفتہ تشبیہوں اور لطیف اشاروں کی زبان میں کرتے ہیں۔ جس سے بڑی رنگینی و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن صفائی اور روانی جو کلام کا جوہر ہے اس میں فرق نہیں آنے پاتا۔"

(۶) گوکھلے کی تقریریں۔ گوکھلے نے ملکی معاملات و حالات پر اکثر اپنی تقریروں میں تعمیری اور مثبت خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چکبست نے اس مجموعہ میں وہ تمام

اہم تاریخی نتیجہ خیز تقاریر، جمع کر دی ہیں جن سے ہندوستانیوں کے دل میں حبِ وطن کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ چکبست کی مرتبہ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ یہ کتاب اُن کی حیات ہی میں شائع ہو گئی تھی۔

چکبست کا شمار اساتذہ سخن میں ہوتا ہے۔ ان کا ادبی مذاق لکھنوی تھا۔ اور لکھنوی رنگ ہی میں اُن کا سارا کلام ڈوبا ہوا ہے۔ اُن کا رجحان طبع مسدس کی طرف زیادہ تھا۔ اس لئے اُنھوں نے میرانیس کے کلام کا بہت کافی مطالعہ کیا تھا۔ بشن نرائن در، گوکھلے، تلک، گنگا پرشاد ورما اور اقبال نرائن مسلدان پر انھوں نے بہت اچھے نوحے لکھے ہیں اور تعریف یہ ہے کہ حفظ مراتب کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ گوکھلے کے متعلق کہا ہے۔

تو اِک ستون تھا ایوانِ سلطنت کیلئے

تلک کے واسطے کہا۔

پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث

بشن نرائن در کے لئے کہتے ہیں۔

کچھ بڑی بات نہیں فاضلِ دوراں ہونا
آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا

اقبال نرائن مسلدان کے لیے کہتے ہیں۔

پیامِ صلح دینا شکوۂ احباب سُن لینا!
ترا شیوہ رہا کانٹوں سے بچ کر پھول چُن لینا

اردو اور ہندی میں پچاس سے زیادہ رامائن کے مصنّف گزرے ہیں۔ اردو میں خوشتر، اشتق اور فرحت کی رامائن ہر اردو داں ہندو کے گھر میں ملے گی۔ چکبست کے مجموعۂ کلام "صبحِ وطن" میں "رامائن کا ایک سین" ان کی مشہور نظم ہے۔ جس میں انھوں نے شری رام چندر جی کا اپنی والدہ سے رخصت ہونا دکھایا ہے۔ چکبست نے یوں تو رامائن کے کئی سین نظم کئے تھے لیکن اُن کی وفات کے بعد اُن کے نظم کئے ہوئے کسی اور سین کا پتہ نہیں چلا۔ پنڈت منوہر لال زتشی کا ایک مقالہ "زمانہ" جنوری ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ رقم طراز ہیں۔

"چکبست کی رامائن کا ایک ٹکڑا چھپ گیا ہے۔ کئی اور ٹکڑے چکبست نے کہے تھے۔ اور اُن کے دوستوں نے اُن کی زبان سے سُنے تھے۔ اُن میں آخری جنگ سے پہلے راون کی تقریر خاص طور سے قابلِ ذکر ہے مگر وہ سب اُن کے ساتھ فنا ہو گئے ہیں۔ اُن کے مرنے کے بعد اُن کے کاغذات کو چھانا مگر افسوس کہ مجھے کچھ نہیں ملا۔"

مرلی والے کی یاد میں نظیر اکبر آبادی سے لے کر اس دور تک بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں۔ مگر چکبست کی نظم کرشن کنہیا کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

آج کی رات کا دنیا کے لئے گیا ہے پیام
حسنِ قدرت کا سرِ شام سے ہے جلوۂ عام
نور برساتے ہیں تاروں کے چھلکتے ہوئے جام
بن گیا سازِ طرب ہستیٔ عالم کا نظام
فرشِ راحت پر اگر آنکھ جھپک جاتی ہے
بانسری کی مرے کانوں میں صدا آتی ہے

گائے پر ایک پُر زور نظم لکھی ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں
چشمۂ فیضِ خدا مردِ خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں
ماں تجھے کہتے ہیں جو ہندو تو بجا کہتے ہیں
کون ہے جس نے ترے دودھ سے منہ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

چکبست ایک قومی شاعر کی حیثیت سے بھی ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے نغموں اور نالوں سے قوم کو بیدار کیا تھا۔ چکبست ہی سرور جہاں آبادی کے بعد وہ پہلے قومی شاعر ہیں جنھوں نے ہندوستانی عوام کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اس ذیل میں عام طور سے اُن کے دور کے شاعروں کی نظر محدود رہی ہے۔ سرزمینِ کشمیر سے ہر کشمیری پنڈت کو خاص اُنس رہا ہے کیونکہ اُن کے آباو اجداد کا وطن کشمیر تھا لیکن اِستدادِ زمانہ سے ان کو اپنی ماتر بھومی کو الوداع کہنا پڑا۔ اس سرزمین کی رنگینیں

پر چکبست کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق کوہ پہ لالے کا لہکنا
مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا

ہر پھول کی جنبش ہے بیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیم سحری کا

چکبست غزل گوئی کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اُن کے مجموعے میں کم و بیش چالیس غزلیں ہیں۔ ان غزلوں میں سوز و گداز نہیں ہے۔ لیکن اخلاقی مضامین اور وطنیت کے جذبات سے وہ بھی مملو ہیں۔ خالص تغزل بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ قابل اعتراض اور ناپسندیدہ مضامین اور غیر مہذب معاملہ بندی کا ایک شعر بھی ان کے یہاں نہیں ملے گا۔

چکبست شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ اُن کی نثر میں سنجیدگی، شگفتگی اور تازگی ہوتی ہے۔ "خدنگ نظر" "زمانہ" "کشمیر درپن" اور "صبح امید" میں وقتاً فوقتاً ان کے لکھے ہوئے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ اُن کی نثر سادگی اور سلاست کے ساتھ نہایت فصیح اور دل آویز ہوتی ہے۔ علامہ کیفی دتاتریہ رسالہ زمانہ جنوری ۱۹۲۹ء میں مضامین چکبست پر ریویو کرتے ہوئے اُن کی نثر کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔

"چکبست کی نثر مولوی عبد الحق کی معقولیت، شبلی کی تحقیق و تدقیق، مولانا سلیم مرحوم کی روانی اور آزاد کی فصاحت و بلاغت کا نچوڑ ہے۔"

مضامین چکبست میں جوالا پرشاد برق، منشی سجاد حسین، پنڈت لکشمی رام سرور اور تربھون ناتھ ہجر وغیرہ کے حالات زندگی اور اُن کی ادبی خدمات پر اگر چکبست کے مضامین شائع نہ ہوتے تو ان بزرگوں کے حالات ان ہی کے ساتھ نابود ہو جاتے۔

چکبست ایک نقاد کی حیثیت سے بھی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے انگریزی اور دوسری مشرقی زبانوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے وہ اصولِ تنقید سے اچھی طرح

Scanned by CamScanner

واقف تھے۔ اُن کی تنقیدیں بے لاگ ہوتی ہیں۔ گلزارِ نسیم کے تصنیف کے سلسلے میں اُن کے جو مضامین شائع ہوئے۔ وہ تاریخ اُردو ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مضامین سے ان کی تنقیدی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا شرر سے ادبی بحث میں ٹکر لینا صرف اُن ہی کا کام تھا۔ اُنھوں نے اس مباحثہ میں غیض و غضب کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا۔

چکبست کے مکاتیب کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ اُن کے پانچ سات خطوط کی نقلیں میں نے مختلف اہلِ ذوق و ادب سے حاصل کر لی ہیں۔ ایک خط ملاحظہ فرمایئے۔ یہ حامد علی خاں بیرسٹر کے نام ہے جن کا چکبست بہت احترام کرتے تھے

۲۴ فروری ۱۹۱۲ء
کشمیری محلہ لکھنؤ۔

جناب خاں صاحب مخدوم و مکرم بندہ تسلیم۔ پنڈت بشن نرائن در صاحب کی تشریف آوری کی تہنیت میں ایک مشاعرہ نیاز مند نے قرار دیا ہے مجھے افسوس ہے کہ تاریخ مشاعرہ مقرر کرتے وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ لکھنؤ میں نہیں ہیں۔ بغیر آپ کے لکھنؤ میں مشاعرہ ویسا ہی ہے جیسے ہیملٹ میں پرنس آف ڈنمارک نہ ہو۔

بہر حال اگر ممکن ہو تو تاریخِ مشاعرہ تک ضرور تشریف لایئے۔ تاریخ مشاعرہ ۳ مارچ ۱۹۱۲ء مقام کشمیری محلہ۔ مصرع طرح۔ ع

بہارِ لالہ و گل سے لگی ہے آگ گلشن میں

آپ کا خادم
برج نرائن چکبست

پنڈت رام پرشاد ترپاٹھی ایم۔اے۔ پروفیسر تاریخ کرشچین کالج لکھنؤ کے بارے میں ایک الوداعی نظم چکبست نے پڑھی تھی یہ نظم اُن کے مجموعہ کلام "صبحِ وطن" میں شامل ہونے سے رہ گئی ہے اس لیے یہاں پیش کی جاتی ہے۔

مبارک آپ کو اوجِ مراتب کا سوا ہونا ۔۔۔ مگر دل میں سے ہم درد مندوں سے جدا ہونا

کہیں کیا دل کی حالت کشمکش ہے رنج و راحت کی
محبت میں ستم ہے اس طرح بے دست و پا ہونا

شکایت ہے زباں سے دل کو اور دل سے زباں عاجز
ہوا دشوار ہم پر حرفِ مطلب کا ادا ہونا

کوئی سمجھے نہ سمجھے آپ کے دل سے نہ بھولے گا
ہمارا کشتیٔ امید کا بے ناخدا ہونا

زباں سے آپ کی تاریخ کے مضموں کی رونق تھی
اس آئینہ پہ اب ممکن نہیں جس کی جلا ہونا

سکھایا آپ کی سیرت نے جو ہر آدمیت کا
یہ وہ احسان ہے ممکن نہیں جس کا ادا ہونا

کمالِ علم بھی آساں ہے اور جودت بھی آساں ہے
مگر آساں نہیں ایسا دلِ دردآشنا ہونا

حقیقت آج ہی ہم پر کھلی دردِ جدائی کی
سنا کرتے تھے ہم بھائی سے بھائی کا جدا ہونا

نہ دولت ہے نہ ثروت ہاں دلِ پرجوش رکھتے ہیں
ہمیں معراج ہے پاسِ عقیدت پر فدا ہونا

یہی تحفہ ہے اپنا اور یہی ہیں پھول رخصت کے
لبوں پر کچھ دعائیں ہیں کچھ آنسو ہیں محبت کے

چودھری جگت موہن لال رواںؔ

رواںؔ ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء کو اناؤ کے ایک معزز شریواستو کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام منشی گنگا پرشاد تھا۔ ابھی نو برس کے تھے کہ باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد رواںؔ کی تعلیم و تربیت اُن کے بڑے بھائی منشی کنہیا لال کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۰۷ء میں انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۱۱ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے اور ۱۹۱۴ء میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر ۱۹۱۶ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کرکے اناؤ ہی میں وکالت شروع کر دی اور چند ہی سال میں وہاں کے سربرآوردہ وکلا میں شمار ہونے لگے۔ شاعری کا مذاق بچپن سے تھا جس کا اظہار عزیزؔ لکھنوی نے "روحِ رواں" کے مقدمہ میں کیا ہے۔

شاعری میں رواںؔ کو عزیزؔ لکھنوی سے تلمذ تھا۔ وہ اپنے اُستاد کا بے حد احترام کرتے تھے۔ پنڈت کشن پرشاد کول نے رسالہ "ترچھی نظر" میں ان کو صفیؔ لکھنوی کا شاگرد لکھا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس غلط فہمی کا سبب کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ رواںؔ نے سوائے عزیزؔ لکھنوی کے کسی اور سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔ رواںؔ کا انتقال تقریباً ۴۵ سال کی عمر میں ۲۶ ستمبر ۱۹۳۴ء کو دن کے گیارہ بجے حرکتِ قلب رُک جانے کی وجہ سے ہوا۔

رواںؔ ایک مرنجان مرنج، خوش طبع اور خوش خلق انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کے لئے۔ کیا ہندو کیا مسلمان، ان کی موت ذاتی غم اور نجی سانحہ

بن گئی تھی۔

جلیل قدوائی نے جو جگت موہن لال رواں کے گہرے دوست تھے۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کے انا ظر میں اپنے تاثرات اور اُن کی موت کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں

"...... ۲۲ ستمبر کی شام کو شکار سے واپس ہوئے۔ چند جنگلی کبوتروں کے سوا اُنہیں شکار میں کچھ نہ ملا۔ جنھیں اُنہوں نے گھر واپس آکر پکوا کے کھایا۔

اکثر اُن کی زبان پر "خود شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے" رہتا تھا۔ مگر یہ خبر نہ تھی کہ یہ مصرعہ اُنہیں پر صادق آئے گا۔ رات کو نکھری ہوئی چاندنی میں اپنے عالی شان مکان کی اوپری منزل کی چھت پر رات کے دو بجے تک اپنی زیر تالیف "مثنوی گوتم بدھ" کے اشعار کہتے رہے پھر وہیں شبنم میں سو گئے صبح اُٹھے تو کسل تھا اور حرارت تھی اسی حالت میں نہائے۔ اتوار کا دن تھا اس لئے آرام کیا مگر بخار چڑھ آیا جس کا معمولی علاج ہوا۔ دوسرے دن بخار ہی کی حالت میں کچہری میں اپنے مقدمات کی پیروی کی۔ تین بجے واپس ہوئے تو حالت بہت خراب تھی۔ رات کو سرسام ہو گیا۔ کسی کو پہچانتے نہ تھے۔ تیسرے دن صبح آٹھ بجے زبان بند ہو گئی۔ گیارہ بجے دن کو سخت اضطراب کی حالت میں دم توڑا...... ہوش کی حالت میں بار بار دل پر ہاتھ رکھتے تھے اور شدید درد بتاتے تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ حرکتِ قلب رُک گئی۔ حکیم کہتے ہیں کہ خون میں زہر پھیل گیا۔ اس لئے اور بھی کہ مرنے کے بعد ناخن اور باہیں اور گلے کے نیچے تک جسم سیاہ پڑ گیا تھا۔ غرض مرض الموت سے مفر نہیں..... چھوٹے بچے کو بار بار گود میں لیتے تھے۔ مرنے سے پہلے بستر مرگ کے چاروں طرف اپنے اعزا کو حسرت و یاس سے دیکھتے تھے خصوصاً بیوی بچوں اور بھائیوں کو اور اپنے مکان اور سارے سامان کو دیکھتے تھے۔ معلوم نہیں اس آخری ساعت میں دل پر رنج و غم کا کیا غلبہ ہوگا۔ مگر افسوس زبان سے کچھ کہہ نہ سکے۔ کہا تو صرف اتنا کہ "اب ہم جاتے ہیں"۔ وہ بھی کس تکلیف سے کہ بس سُننے والوں کے جگر شق ہو گئے۔

ایسے اے دوست تم ہوئے ہم سے جدا
باقی نہ رہا کچھ بھی زندہ رہنے کا مزا

Scanned by CamScanner

تم کہہ سکے ہم سے کچھ نہ ہم کچھ تم سے
معلوم نہیں دلوں پہ گزری کیا کیا"

۲۶ر ستمبر ۱۹۳۴ء ہی کو اُن کے جنازے کو گنگا گھاٹ لے جانے کا انتظام کیا گیا۔ جس وقت اُن کے مکان سے جنازہ اُٹھا ہے ہزاروں کی تعداد میں۔ ہندو اور مسلمان جنازے کے ساتھ تھے۔ سارے اناؤ میں ایک کہرام مچ گیا تھا اور ہر طرف سے آہ و بکا کی صدا آتی تھی۔ ہندوستان کے تقریباً تمام مشاہیر نے نوحے، نظمیں اور قطعات تاریخ لکھ کر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے روانؔ کے اُستاد بھائی جوشؔ ملیح آبادی نے "ماتمِ رواں" کے نام سے نظم اور ایک رباعی لکھی تھی۔ رباعی اور نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

کیا موت نے تصویر مٹائی افسوس
اِک آن میں ہو گئی جدائی افسوس
ایّامِ شباب اور پیغامِ فنا
اے عمرِ رواںؔ یہ بیوفائی افسوس

اِک ایسا صدمہ جانکاہ پہنچا ہے کہ رہ رہ کر
خود اپنی زندگی کی تلخیوں کو بھول جاتا ہوں
نہ پوچھو اس عزتِ غم کو کہ ہو جاتا ہوں شرمندہ
اگر بھولے سے بھی میں تیرہ قسمت مسکراتا ہوں
کبھی سازِ خرد کی خامشی پر آہ بھرتا ہوں
کبھی زلفِ جنوں کی برہمی پر سر جھکاتا ہوں
نہ جانے کون مطرب اُٹھ گیا ہے بزمِ عالم سے
کہ اپنے دل کے اندر ایک سناٹا سا پاتا ہوں
فضا تاریک ہو جاتی ہے تارے کانپ اُٹھتے ہیں
رواںؔ کی موت پر راتوں کو جب آنسو بہاتا ہوں

روانؔ شاعری کا بڑا ستھرا اور سلجھا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ اُن کی پُرگوئی اور شاعرانہ

صلاحیتوں نے بہت جلد اپنا سکہ منوالیا۔ عزیز لکھنوی نے انہیں "بلبلِ چمنستانِ شاعری" اپنا شاگرد ہونے کی وجہ سے نہیں کہا تھا بلکہ یہ رواںؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا حقیقی اعتراف تھا۔ قومی احساسات و خیالات کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام میں جذبات و کیفیات کے اظہار کے بڑے دلکش نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ روحِ رواں۔ یہ رواںؔ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اسے مارچ ۱۹۲۸ء میں نامی پریس لکھنؤ سے خود انھوں نے عمدہ طباعت و کتابت کے ساتھ سفید کاغذ پر مجلد شائع کیا تھا۔ شروع میں عزیز لکھنوی کا لکھا ہوا ۵۱ صفحات کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔ اس کے بعد دو صفحے رواںؔ نے "عرضِ حال" کے عنوان سے لکھ کر شامل کیے ہیں۔ روحِ رواں چار حصوں میں منقسم ہے۔ سب ملا کر ۲۱۲ صفحات ہیں پہلے حصہ میں نظمیں ہیں، دوسرے میں غزلیں، تیسرے میں قطعات اور چوتھے حصے میں رباعیات ہیں۔ جگر بریلوی یادِ رفتگاں میں اس مجموعے کے سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

"آپ کا مجموعہ ترقی یافتہ دور کا نہایت کامیاب اور قابلِ قدر نمونہ ہے۔ اس میں قدرتی مظاہر و مناظر بھی ہیں۔ جذباتی کیفیات بھی ہیں۔ قومی خیالات و احساسات بھی ہیں۔ فلسفہ، اخلاقیات، عرفانیات اور کچھ واقعات بھی ہیں۔"

۲۔ رباعیاتِ رواں۔ رباعیوں کا یہ مختصر مجموعہ جس میں ۱۸۱ رباعیاں ہیں ۱۹۲۶ء میں کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور میں طبع ہوا۔ گوپی ناتھ امن لکھنوی نے دورِ جدید دہلی کے اردو نمبر میں رواںؔ کے رباعیات کے مجموعے کا نام "روحِ رواں" لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ میرے کتب خانے میں رباعیاتِ رواں کے نام سے ایک مجموعہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ مجھے رواںؔ کی رباعیوں کے کسی دوسرے مجموعہ کا علم نہیں۔

رواںؔ کا اصل جوہر اُن کی رباعیوں میں کھلتا ہے۔ اُن کی جدت آفرینی اور مذاقِ سلیم نے نہ صرف رباعیوں کو لطافت و رنگینی بخشی بلکہ انہیں فارسی رباعیات کے ہم پلہ کر دیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رباعیات کا یہ مجموعہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اصغر گونڈوی مرحوم نے رباعیاتِ رواںؔ کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"اگر جناب رواںؔ کے کُل ادبی و شاعرانہ خدمات کو نظرانداز کردیا جائے جب بھی یہ مختصر مجموعہ رُباعیات ان کی شاعرانہ عظمتوں اور اُن کی ادبی خدمات کے ثبوت کے لئے بالکل کافی ہے۔ اُن کے جدّت آفریں دماغ اور اُن کے سلجھے ہوئے مذاق نے اردو شاعری کی ایک مخصوص صنف رباعی کو کس حد تک لطافت اور رنگینیوں سے فارسی رباعیوں کے دوش بدوش کردیا ہے"۔

(۳) فریبِ عمل۔ گالزوردی کی Skin Game کا ترجمہ رواںؔ نے نثر میں فریبِ عمل کے نام سے کیا تھا۔ رواں کا یہ ترجمہ ہندوستانی اکیڈمی اترپردیش الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ رواں کا یہ ترجمہ ادب میں کوئی درجہ حاصل نہ کرسکا۔ ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زبان و بیان کے لطف کے ساتھ اصل تصنیف کی روح باقی رہے۔ اور پڑھنے والے کو یہ محسوس ہو کہ یہ کوئی ترجمہ نہیں بلکہ بجائے خود ایک تصنیف ہے۔ اس میں ان خصوصیات کا فقدان ہے چنانچہ بعض نقادوں نے اس پر اعتراضات بھی کئے ہیں۔

(۴) نقدِ رواں۔ گوتم بدھ کی سوانح حیات اور اُن کے اصول حیات و طریق نجات کو رواں نے مولانا روم کی مثنوی کی بحر میں نظم کرنا شروع کیا تھا۔ جو نا تمام رہ گیا۔ اُن کی وفات کے بعد وحشی کانپوری نے اس مثنوی کو مکمل کیا۔ رواں کے صاحبزادے پربھان شنکر سروش نے ۱۹۵۱ء میں نامی پریس لکھنؤ سے اس مثنوی کو طبع کرایا۔ یہ مثنوی اگرچہ گلزارِ نسیم، سحرالبیان، پیاسِ ساوتری اور نہرِ عشق کی طرح قبولِ عام کا درجہ نہ پا سکی۔ لیکن اس کی ادبی حیثیت شکنتلا، دافع غم ادب اور ترانۂ شوق جیسی مثنویوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ نقدرواں کے بارے میں سید رفیق مارہروی "ہندوؤں میں اردو" میں رقمطراز ہیں۔

"آپ کی ایک مثنوی ہے جس میں مہاتما بدھ کی سوانح حیات اور اُس کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی اب تک طبع نہیں ہو سکی"۔

رفیق مارہروی کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ رفیق صاحب کی کتاب ہندوؤں میں اردو" ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی ہے اور مثنوی نقدرواں اس کتاب سے چھ سال پہلے شائع ہو چکی تھی۔ وحشی کانپوری نے نقدرواں پر اپنی تقریظ میں اس کے

متعلق لکھا ہے کہ ۔

پھر بھی اس کتاب کی شان سب سے نرالی ہے۔ اور ادب اردو میں یہ ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ صنائع بدائع یا ضلع جگت میں یہ دیگر مثنویات میں سبقت نہ لے جا سکے۔ لیکن واقعات درس آموز حیات اور اُن کے لطیف تاثرات کے اعتبار سے یہ اردو میں پہلی مثنوی ہو گی جو بقائے دوام حاصل کرے گی۔ اس سے آئندہ نسلیں درسِ حیات لیں گی۔ اور خوابیدہ روحیں بیدار ہوتی رہیں گی۔ اس کے مطالعہ سے ناظرین پر روشن ہو جائے گا کہ رواں مرحوم نے اردو کے ساتھ کتنا احسان کیا ہے۔ اس مثنوی میں مہاتما گوتم بدھ کی پیدائش، بلوغیت شادی اور ترکِ دنیا کے واقعات اور علی الخصوص ان کا فلسفہ تعلیم اس قدر دلچسپ پیرائے میں نظم کیا گیا ہے۔ کہ اس کو پڑھ کر انسان کی چشمِ بصیرت کھل جاتی ہے"

رواں کا شمار صفِ اوّل کے شعرا میں کیا جاتا ہے۔ وہ غزل، نظم، رباعی پر پوری قادرت رکھتے تھے۔ لیکن ان کا اصل جو ہر رباعی میں کھلتا ہے۔ ان کی نظموں میں پختگی بھی ہے اور شگفتگی بھی۔ اپنی رنگین بیانی اور بلند خیالی سے جو لطف وہ نظموں میں پیدا کر دیتے ہیں وہ اکثر شاعروں کو نصیب نہیں۔ ہندوستانی فضا اند ہندی ماحول سے بھی ان کی نظمیں بھرپور ہیں۔

روحِ رواں میں کل تیس نظمیں ہیں۔ اُن میں چند کے سوا باقی نظمیں روانی برجستگی، تخیل کی بلند پروازی، اچھوتی تشبیہوں اور نادر استعاروں کے باعث بہترین شعری ادب کہے جانے کی مستحق ہیں۔ مثال کے طور پر، سرودِ عشق، معمائے فطرت، تتلی، لاوارث بچہ، معجزۂ انتظار، چتر کوٹ، شاعری، دو آئینے اور غبارہ وہ نظمیں ہیں جو اردو ادب میں زندہ رہنے والی ہیں۔

غبارہ، رواں کی بہترین نظم کہی جا سکتی ہے۔ یہ نظم تخیل کی بلندی اور اچھوتی تشبیہات کا بہترین نمونہ ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

زمیں سے جانبِ بامِ فلک رواں ہے تو ۔۔۔ مسافرِ رہِ بے جادہ و نشاں ہے تو
ہوا پہ اک فرسِ شعلہ جست کرکے چلا ۔۔۔ کہ کوئی طائرِ زرّیں اڑان بھر کے چلا
بلندیوں کی طرف مثلِ برقِ طور چلا ۔۔۔ کمالِ شوق سے دامن میں بھر کے نور چلا

پڑا ہے یا کسی میکش کا صبرِ رندانہ
اُلٹ گیا ہے مئے آتشیں کا پیمانہ
فنا کے دوش پہ کچھ اس طرح سوا ہے تو
کہ بیکسوں کا چراغِ سرِ مزار ہے تو

نظم "شاعری" کی مقبولیت اور ادبی حیثیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اکثر نقادوں اور ادیبوں نے اسے بہترین نظموں میں شمار کیا ہے اور اس کے مندرجہ ذیل بند کو رقم کیا ہے۔

اللہ اللہ یہ ہے وسعتِ دامانِ غزل
ختم پنہائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل
بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل
پوچھئے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل
ضبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

اس میں شاعری کی حقیقت اور اس کی وسعت کو بڑے دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

تتلی پر اردو اور ہندی میں بیسیوں نظمیں لکھی گئی ہیں۔ مگر تتلی پر رواں کی نظم کئی اعتبار سے نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان کی روانی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ ندرتِ تشبیہ قابلِ دید ہے۔

حسن صدقے ہے ترے رنگِ پر پرواز پر
لوٹی جاتی ہیں ادائیں تیرے ہر انداز پر
بن کے یوسف حسن خود آیا ہے یا بازار میں
پڑ گئی ہے جانِ تازہ یا گلِ گلزار میں

جسم ہلکا سا ترا بازو سبک اور پر سبک
آتشِ گلشن کے ہیں شعلے سبک اخگر سبک

ذیل کے اشعار بھی کس قدر پر لطف ہیں۔

اُڑتے پھرتے دیکھ کر تجھ کو ہوائیں شاد شاد
اک عجب حسرت سے بچپن کی ہمیں آتی ہے یاد
سخت کوشش پر ہماری بھی نہ ہاتھ آتی تھی تو
تجھ تلک چٹکی پہنچتی تھی کہ اڑ جاتی تھی تو

معترف ہوتے تھے چالاکی کے تیری دمبدم
اوز ہوا پر تجھ کو پہروں تاکتے رہتے تھے ہم

معجزہ انتظار میں کیفیت انتظار کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وقتِ غروب آفتاب حالت انتظار میں
بیٹھی ہے ایک مہ جبیں محو خیالِ یار میں
الجھے ہوئے سر کے بال جامہ تمام پر شکن
چہرہ پہ ایک سادگی جس میں ہزار بانکپن
قاعدۂ شمار سے ختم ہے اب فراقِ دوست
اس لئے اور تیز ہے آتشِ اشتیاقِ دوست
اتنے میں اک کنیز نے مژدہ جانفزا دیا!
دل کو مراد مل گئی نامہ لیا۔ صلہ دیا
آئینہ محو حسن تھا خلوت خاص تھی مگر
صورتِ یار آتی تھی دیدۂ شوق کو نظر

رامائن اور مہا بھارت پر اردو شاعروں نے اتنا منظوم لٹریچر اردو زبان کو دیا ہے کہ وہ ہندوستان کی بعض علاقائی زبانوں میں بھی نہیں مل سکتا۔ رواںؔ نے بھی رامائن اور مہا بھارت کے کئی سین نظم کئے ہیں۔ اس سلسلے میں۔ "رحلت بال" "چتر کوٹ" "شکتی بان" اور "پیام رکمنی" اُن کی قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ شری رام چندر جی، لچھمن جی اور جانکی جی کے ساتھ جنگل کو روانہ ہوتے ہیں۔ اور چتر کوٹ پہنچ کر ایک جگہ مقیم ہو جاتے ہیں۔ دور سے کچھ غبار اُٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ لچھمن جی، رام چندر جی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

گرد و غبار دیکھ رہے ہیں حضور کچھ
نزدیک آ گئی نہیں اب فوج دور کچھ
شک ہے مجھے کہ آج خطر ہے ضرور کچھ
نیت میں آ گیا ہے بھرت کی فتور کچھ
اس کا سوائے جنگ کے انجام کچھ نہیں
اس قافلے کا ورنہ یہاں کام کچھ نہیں

Scanned by CamScanner

شری رام چندر جی لچھمن جی کو جواب دیتے ہیں کہ آپ کا خیال غلط ہے میرے بھائی بھرت ایسے نہیں ہیں جو اس طرح بدل جائیں۔

جگنو سے جیسے آگ کا جلنا محال ہے | اہلِ وفا کے قول کا ٹلنا محال ہے
مغرب سے آفتاب نکلنا محال ہے | لچھمن یوں ہی بھرت کا بدلنا محال ہے

بھائی کہاں جہان میں ایسے وفا شعار
یوں ہو کے بدگمان نہ ہو تم گنہگار

بھرت جی کا سفر جب ختم ہو جاتا ہے اور وہ چترکوٹ میں اپنے بھائیوں کے قریب آتے ہیں اور انہیں بن باسیوں کے روپ میں دیکھتے ہیں تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ بھائی کو بھائی سے کیسی محبت والفت ہوتی ہے اُسے کتنے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس موقع کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

یہ دیکھ کر بھرت کو ہوا اس قدر ملال | چلا اُٹھے کہ جانِ برادر یہ کیا ہے حال
دیکھے وہ آکے جو ہے طلب گارِ ملک و مال | اور ہو غریقِ لجۂ تحقیر و انفعال

اللہ رے حرص۔ ذوقِ تمنا کے واسطے
عقبیٰ پہ خاک ڈالی ہے دنیا کے واسطے

رام اُٹھ کھڑے ہوئے جو بھرت پر پڑی نظر | لپٹا لیا گلے سے برادر کو دوڑ کر
منظر وہ تھا فرشتے بھی حیراں تھے چرخ پر | نقش الم ادھر یہ وہ تصویر غم اُدھر

کلفت جو تھی دلوں میں وہ اشکوں سے دھو گئی
اتنے بھر آئے دل کہ زباں بند ہو گئی

رواں اعلیٰ درجے کے غزل گو بھی تھے۔ اُن کی غزلوں میں فلسفہ وحکمت اور اخلاقی مضامین کثرت سے نظم ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُن کی غزلوں کا عام رنگ یہی ہے۔ بہر حال اخلاقی اور حکیمانہ نکتہ ہو یا کوئی اور بلند مضمون وہ نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ترنم بھی ہے اور سوز و گداز بھی جو غزل کی جان ہے۔ جگر بریلوی نے یادِ رفتگاں میں ان کی غزلیہ شاعری کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

"رواں کی غزلیات پر اُن کا یہ شعر بالکل صادق آتا ہے

روانِ ذوقِ سخن تیرا تجھے خود داد دیتا ہے
ترا انداز ہے اندازِ مرغانِ خوش الحاں کا

اور یہ واقعہ ہے کہ وہ مشکل الفاظ اور نامانوس ترکیبوں سے اشعار کو گرانبار نہیں کرتے بلکہ سیدھے سادے نرم، مانوس اور شستہ الفاظ اور سلیس ترکیبوں کے پردے میں اس طرح ادائے مطلب کر جاتے ہیں اور بڑے بڑے نکات بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا جھوم اُٹھتا ہے۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

بس تھم گیا سفیرِ عمل کہہ کے یا نصیب
جس جا پہ ختم منزلِ تدبیر ہو گئی

سہل سی اک بات ہے مرنا مگر اُف قیدِ زیست
روح کے آزاد ہونے کو زمانہ چاہیئے

گل و لالہ پہ آخر کر رہا ہے غور کیا گلچیں!
وہی خوں ہے جو ٹپکا تھا کبھی چشمِ عنادل سے

یہ کس نے آخرِ شب پردہ ہائے نور سے جھانکا
کہ لَو دینے لگا ہر ایک ذرّہ بزمِ امکاں کا

تڑپتی پھرتی ہے اک برقِ عرفاں میکدے بھر میں
کبھی مینا میں خم سے اور کبھی مینا سے ساغر میں

بہر تقدیر کچھ دن کاٹنا تھے قیدِ ہستی کے
قفس برباد کر کے آشیاں برباد کیا کرتے

کسی طرح نہ مرے دل کو جب قرار آئے
مری بلا سے خزاں آئے یا بہار آئے

کہاں سے کہاں لائی قسمت مری
کس آفت میں میں مبتلا ہو گیا

ہنسے بھی روئے بھی لیکن نہ سمجھے
خوشی کیا چیز ہے دنیا میں غم کیا

ہزاروں پھول مٹ کر اک کلی صورت دکھاتی ہے
یہی قانونِ فطرت آپ عالم گیر دیکھیں گے

نزع میں آ کر کھلا ہے عالمِ فانی کا راز
اے مری جاتی ہوئی دنیا بڑا دھوکا ہوا

نہ گل ہوئی ہے نہ شمعِ حیات گل ہو گی
ہزار بار یونہی انجمن میں آئی ہے

رواںؔ کا اصلی جوہر رباعیوں میں کھلتا ہے۔ اور چیزوں سے قطع نظر ان کی رباعیوں ہی کو لے لیا جائے۔ یہ اُن کی شاعرانہ عظمت اور اُن کے ادبی وقار کے لئے کافی ہیں۔ اُن کی رباعیوں کو ٹامل فارسی رباعیات کے برابر رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں اُن کی جدت آفرینی اور اُن کے ستھرے مذاق کو بڑا دخل تھا۔ رواںؔ نے اس صنفِ شاعری کو اتنی وسعت دی اور اُسے ایسی رنگینی اور لطافت بخشی کہ اُن کی رباعیاں اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ بن گئیں۔ فلسفیانہ خیالات کے علاوہ انھوں نے اخلاق اور عظمتِ انسانی کے مضامین اور مناظرِ قدرت کو بھی اپنی رباعیوں میں جگہ دی ہے۔ لیکن یہاں بھی انھوں نے سلاست اور رنگینی و لطافت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔

جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی نقیبِ رواں پر اپنے مقدمہ میں رواںؔ کی رباعیوں

کے متعلق لکھتے ہیں۔

"یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ رواںؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو میں رباعی کو دیگر اصنافِ سخن میں ایک ممتاز جگہ دی۔ اُن سے پیشتر اردو میں کسی نے اتنی متنوع اور ایسی اچھی رباعیاں نہیں کہی تھیں۔ جوشؔ نے اس طرف رواںؔ کے بہت بعد توجہ کی۔"

مولانا ضیا احمد نے لکھا ہے کہ

"رواںؔ کی رباعیاں اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہیں۔"

فراقؔ گورکھپوری اپنے مضمون "اردو شاعری" کے گزشتہ پچاس برس" مطبوعہ نیا دور (لکھنؤ) شمارہ نومبر ۱۹۶۳ء میں لکھتے ہیں۔

"موجودہ دور میں جس صنفِ سخن نے سر بہ فلک بلندیوں کو طے کیا ہے وہ صنفِ سخن رباعی ہے۔ چودھری جگت موہن لال رواںؔ کی رباعیاں تمام گزشتہ ادوار کی رباعیوں سے بلیوں اونچی ہیں۔"

نمونہ کے طور پر چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔

کیا تم سے بتائیں عمرِ فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا، جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی یا ہوا کا جھونکا
اِک موجِ فنا تھی زندگانی کیا تھی

کل صبح نے مسکرا کے تاروں سے کہا
ہو جائیں گے اب تمہارے انوار فنا
تاروں نے کہا کہ ہم رہیں گے یوں ہی
تو آئے گی اور ختم ہو جائے گی آ!

نوروز ہے غرقِ بادہ دنیا کر دے
میرا ارمان آج پورا کر دے
پی لوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی
تو کاسۂ آسماں کو سیدھا کر دے

کس کے جلووں کی یہ فراوانی ہے
کیسی آخر یہ بزم نورانی ہے
یہ ماہِ دو ہفتہ اور یہ صبحِ جمیل
کس کا رخسار کس کی پیشانی ہے

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے
پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے
اس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے بھلا
یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے

جتنے انوارِ حسن صورت کے ہیں
سب نغمہ نوازِ بزمِ قدرت کے ہیں
یہ آب و سحاب و برق و باد و باراں
پردے دو چار سازِ فطرت کے ہیں

میرے ساقی شرابِ صافی دینا
ہو جس سے گنہ کی کچھ تلافی دینا
اُترے نہ خمار زندگی بھر جس کا
ایسی دینا اور اتنی کافی دینا

اپنے ساقی سے کل یہ پوچھا میں نے
کتنے میخوار تشنہ لب آتے ہیں
بولا کہ مقدرات ہیں ساغر و مے
آنے کی اگر کہو تو سب آتے ہیں

فکرِ رزق و معاش اے دل کیا ہے
یہ کس کو خبر کلیدِ منزل کیا ہے
دانے دانے پہ جب کہ ہے مُہر رواں
اس کاوشِ بے محل کا حاصل کیا ہے

!

Scanned by CamScanner

اُف باغِ اُمید کے نمو کی تاثیر!
پتی پتی کے رنگ و بو کی تاثیر!
کانٹوں میں بھی دلکشی ہے پھولوں کی سی
اللہ رے فریبِ آرزو کی تاثیر

●●

Scanned by CamScanner

منشی دیا نرائن نگم ——— اور رسالہ زمانہ

منشی دیا نرائن نگم کان پور کے ایک معزز و سربر آوردہ نگم کائستھ خاندان میں ۲۲ مارچ ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا منشی شیو سہائے کانپور ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیرمین تھے۔ آپ کے والد منشی شیو پرشاد کا شمار کان پور کے ممتاز وکیلوں میں ہوتا تھا۔ منشی دیا نرائن نگم کی بسم اللہ اردو فارسی سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے پانچویں درجہ میں داخل ہو گئے اور ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا۔ پھر ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے بزرگ آپ کو وکیل بنانا چاہتے تھے لیکن آپ نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت میں بسر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اور اس پر ساری زندگی قائم رہے۔

آپ کا پہلا مضمون رسالہ 'مخزن' لاہور میں جولائی ۱۹۰۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد زمانہ کے نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ء کے مشترکہ شمارے میں مرتب کی حیثیت سے منشی دیا نرائن نگم کا نام پہلی بار اردو دنیا کے سامنے آیا۔ اس کے بعد سے مسلسل چالیس سال تک منشی جی رسالہ زمانہ کے ذریعہ اردو ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیتے رہے۔ تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں اچانک یکم نومبر ۱۹۴۲ء کو آپ کا چراغِ زندگی گل ہو گیا۔ اُن کی وفات پر اردو اور ہندی کے نقادوں، ادیبوں اور شاعروں نے جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جتنا کچھ لکھا ہے۔ اس سے ایک ہزار صفحات کی ایک کتاب بآسانی ترتیب دی جا سکتی ہے بلکہ

زمانہ کا فروری و مارچ ۱۹۴۲ء کا مشترکہ شمارہ اُن کے صاحبزادے مسٹر سری نرائن نگم ایم۔ اے کی ادارت میں یادگار نمبر کے طور پر شائع ہوا تھا۔ یہ یادگار نمبر درحقیقت ایک دستاویز ہے۔ جس میں اردو اور ہندی کے ادیبوں اور شاعروں نے بلند پایہ ادیب منشی دیا نرائن نگم کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف یادگار نمبر میں فرماتے ہیں۔

"زبانِ اردو کا کوئی شیدائی ان بیش بہا خدمات کو جو منشی دیا نرائن نگم نے اپنی زندگی میں انجام دیں فراموش نہیں کر سکتا۔"

ہندی کے ممتاز ادیب دیوی دت شکل اڈیٹر سرسوتی الہ آباد یادگار نمبر میں رقمطراز ہیں۔

"درحقیقت وہ ایک بلند پایہ ادیب تھے۔ اُن کی ادبی زندگی کسی بھی ادیب کی رہنمائی کے لئے سنگِ راہ کا کام دے سکتی ہے۔ اس پایہ کا ادیب نذرِ عقیدت پیش کئے جانے کا مستحق ہے۔"

منشی جی کی وفات پر کم سے کم پچاس قطعات تاریخ وفات اور نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ ایک چھوٹی سی نظم "اظہارِ غم" تلوک چند محروم کی ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

اظہارِ غم

بجھ گئی آہ شمعِ بزمِ ادب — چل دیئے حضرتِ نگم افسوس
روئیے جس قدر بجا ہے آج — کیجئے جس قدر ہے کم افسوس
پیکرِ دل نواز صدق و صفا — مٹ گیا ہو کے مرتسم افسوس
حسنِ تحریر کا حسیں دریا — رہ گیا رُک کے یک قلم افسوس
سخن آرا ہیں وقفِ خاموشی — کرتے ہیں نکتہ داں بہم افسوس
ہوئے جاتے ہیں ہمرہاں اپنے — راہیِ منزلِ عدم افسوس
جانِ واماندہ کے نصیب میں ہیں — آہ و فریاد و رنج و غم افسوس
حسرتِ دیدِ رفتگاں ہمراز — ہمسفر دردِ ہمقدم افسوس
رہ گئی یادِ رسم و راہِ قدیم — جیتے جی مل سکے نہ ہم افسوس

رسالہ زمانہ کا سب سے پہلا شمارہ ماہ فروری ۱۹۰۳ء میں مطبع قیصری بریلی میں با اہتمام داروغہ مہاراج پرشاد منیجر و پبلشر طبع ہوا تھا۔ اس کے سب سے پہلے اڈیٹر بابو شیو برت لال ورمن ایم۔اے تھے جو دو سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ اُن کی ادارت میں زمانہ ماہ فروری ۱۹۰۳ء سے ماہ اکتوبر ۱۹۰۳ء تک شائع ہوتا رہا۔ لیکن بعض قلم کاروں نے غلط فہمی کی بنا پر یہ لکھ دیا ہے کہ اس کے پہلے اڈیٹر منشی دیا نرائن نگم تھے۔ اسی طرح اس کی تاریخ اجرا کے بارے میں بھی تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ چنانچہ عبدالرزاق قریشی کا ایک مقالہ دسمبر ۱۹۵۹ء کے رسالہ آج کل (اردو) میں نگم صاحب پر شائع ہوا ہے۔ اس میں قریشی صاحب نے لکھا ہے کہ۔

"زمانہ ۱۹۰۱ء میں بریلی سے نکلتا تھا۔"

اس رسالہ کے سلسلے میں اس قسم کا سہو مولانا حسرت موہانی ڈاکٹر سچدانند سنہا اور دوسرے اردو ہندی اور انگریزی کے ادیبوں سے بھی ہوا ہے رسالہ زمانہ کے ماہ فروری ۱۹۰۳ء کے شمارے میں جس پر جلد نمبر۱ اور شمارہ نمبر۱ درج ہے' اس کے اجرا کی غرض و غایت کے بارے میں بابو شیو برت لال ورمن ایم۔اے یوں رقم طراز ہیں۔

(۱) زمانہ کے نمونے کا پرچہ بہ تعظیم تمام نذر خدمت کیا جاتا ہے۔
گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

(۲) عاشقِ ملک ہے دیوانہ ہے
وہ اس اِک شمع کا پروانہ ہے
دین و آئین یہی ہے اس کا
حامیِ مذہبِ فرزانہ ہے

(۳) زمانہ کی اشاعت ایک خاص غرض کی تکمیل ہے۔ اُردو زبان میں مغربی و مشرقی خیالات کے اتحاد کی تصویر کو پیش کرتے رہنا اور ان علوم و فنون و ضروری واقعات پر خامہ فرسائی کرنا جو ہمارے طرزِ معاشرت پر اثرانداز

ہوتے ہیں۔ اور جن کی معمولی واقفیت تہذیب وشائستگی کا معیار قرار دی
جاتی ہے' اس کا عین مقصد ہے۔

(۴) زمانہ میں ہر قسم کے مضامین سوشل و پولیٹکل زیرِ بحث آئیں گے
اور احتیاط کی جائے گی۔ زمانہ حال کے خیالات میں وسعت پیدا ہو اور اس
ملک کی سب قومیں باہم شیر و شکر کی طرح مل کر قومی اتحاد کے اصولوں پر
عمل کریں۔

(۵) زمانہ کی کوشش ہوگی کہ وہ گورنمنٹ کی منشا کو عوام پر اعلان کرے
اور عوام کی خواہش و تمنا کو بلا کم و کاست سرکار تک پہنچائے اور فریقین
کی لاعلمی کے دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو

منشی شیو برت لال ورمن کی اڈیٹری کے زمانے میں رسالے کے
پانچسو سے زیادہ خریدار ہو گئے تھے۔ ورمن صاحب نے رسالہ میں ادبی
تاریخی' مذہبی اور سائنسی مضامین شائع کئے اور بہت سے رسالوں سے
مختلف مضامین اقتباس کئے۔ منشی کندن لال شرر سہارنپوری' منشی
دوارکا پرشاد گوہر اور منشی رام بہادر لال جویا آنولوی کی نظمیں بھی ماہ فروری
۱۹۰۳ء سے ماہ اکتوبر ۱۹۰۳ء تک کے شماروں میں شائع ہوئی ہیں۔ فانی بدایونی
کی ایک غزل "دارِ فنا" کے عنوان سے مئی ۱۹۰۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی
ہے۔ جو اُن کے دیوان "دیوانِ فانی" مطبوعہ نقیب پریس بدایوں میں بھی موجود
ہے۔

ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ء کے مشترکہ شمارے سے زمانہ منشی دیا نرائن نگم
کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا۔ اس مشترکہ شمارے میں چکبست لکھنوی
کا لکھا ہوا رانا ڈے کا نوحہ اور "ہندوستان اور فارسی زبان" کے عنوان سے
پروفیسر مولوی مرزا محمد جان دہلوی کا مضمون شائع ہوئے ہیں۔ اس مضمون اور
نظم کے علاوہ اور بھی مضامین اس میں شائع ہوئے ہیں۔ علمی خبریں' نوٹس اور
تذکرے کے عنوان سے منشی دیا نرائن نگم نے کئی قابلِ ذکر ادبی باتوں کا ذکر
کیا ہے۔ غالب کے بارے میں یہ خبر ملاحظہ فرمائیے۔

Scanned by CamScanner

"غالب کی مشکل پسندی، بلند خیالی اور نکتہ رسی مشہورِ عام ہے۔ عمدہ
شعرا میں اُن کا کلام زیادہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے کیونکہ فلسفی شعرا اردو
ے مرزا غالب ہی سرتاج ہیں۔ افسوس ہے کہ اردو کے ایسے مشکل پسند شاعر کے
لام کو بغور پڑھنے کے لئے بہت کم مصالحہ موجود ہے۔ اور یہ شکایت غالب
ی کے کلام پر محدود نہیں ہے۔ ابتک اردو ادب میں اُن کے متعلق مولانا حالی
ں مشہور کتاب ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں اگر کسی اور زبان اور ملک کے شاعر ہوتے
و ابتک اُن کے متعلق سیکڑوں کتابیں تیار ہو گئی ہوتیں۔ مگر اردو اور ہندوستان
ں یہ باتیں کہاں؟ ایسی حالت میں مرزا مرحوم کی اردو دیوانوں کی دو شرحیں جو
ل میں حیدرآباد سے نکلی ہیں۔ غنیمت معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے مصنف۔
لوی عبدالواحد حیدرآبادی اور اُن کے والد مولوی عبدالعلی صاحب پروفیسر
لام کالج حیدرآباد دکن ہیں"۔

زمانہ بابت جنوری ۱۹۰۴ء میں رسالہ کے اڈیٹر کی تبدیلی کے سلسلے میں
ی دیا نرائن نگم فرماتے ہیں۔

"زمانہ کی اڈیٹری میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ ناظرین پر سرورق سے ظاہر
ئی ہوگی۔ یہ تبدیلی بڑے پس وپیش کے بعد منظور کی گئی ہے۔ اپنی کم مائیگی بے
) کا یقین مانع تھا۔ کہ اس کام کو اپنے ذمہ لیا جائے۔ مگر شوق اکتساب بات
اور جوش خدمت ملکی اور خیالی رسالہ ہذا نے بالآخر فتح پائی۔ اور نتیجہ یہ ہوا
زمانہ کی ترتیب کم سے کم کچھ دنوں کے لئے اپنے سرلی گئی۔ مگر اس نازک
مت کا خوبی اور خوش اسلوبی سے سرانجام پانا اہلِ قلم کی دستگیری اور سرپرستی
بغیر ناممکن ہے۔ شکر ہے کہ ملک کے ایک کثیر التعداد اہلِ قلم کی جانب سے یہ
د بلا دریغ ملی ہے۔ جو بہرحال زمانہ کی عمدگی اور ہماری حوصلہ افزائی کا
ث ہے۔ ہم اپنی طرف سے زمانہ کو ملک میں مفید اور جامع میگزین
نے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ مگر ہماری کوششوں کی کامیابی بہت
اہلِ ملک کی قدردانی اور حوصلہ افزائی پر منحصر ہے۔

اس اہم ذمہ داری کے لیتے وقت زمانہ کو ملک کے اور دلچسپ

دلکش میگزینوں سے جدا اصولوں پر چلانے کا ارادہ کر لیا گیا ہے۔ کافی غور و فکر اور صلاح و مشورہ کے بعد یہ طے پایا ہے کہ زمانہ محض شاعری اور انشاپردازی کے ہاتھ رہن نہ رکھ دیا جائے۔ کیونکہ ملک میں ایسے رسالوں کی ایک کافی تعداد موجود ہے۔ جو زبانِ اردو کے لئے عمدہ کام کر رہے ہیں۔ زمانہ میں حتی الوسع ترقیِ زبان کا خیال لئے ہوئے اصلاحِ خیالات، درستیِ مذاق، توسیع معلومات، ترقیِ اتحاد وغیرہ کا خصوصیت سے التزام رکھا گیا ہے۔ مگر ان ارادوں کا پورا ہونا بہت کچھ تائیدِ غیبی اور امدادِ باہمی پر موقوف ہے۔ اس لئے دل سے دعا ہے کہ خدا ہماری کوششوں میں برکت دے۔"

منشی دیا رام نگم کی ارادت میں زمانہ نومبر دسمبر ۱۹۰۳ء سے اکتوبر ۱۹۴۲ء تک نکلتا رہا۔ زمانہ کا یہ دور اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اردو ادب کی تاریخ اگر کوئی لکھنا چاہے تو اس رسالہ کی چالیس سال کی فائیلوں میں اردو ادب کی چالیس سالہ تاریخ مل جائے گی۔

زمانہ کی یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہے کہ جہاں اس کے ذریعے بہت سے گمنام ادیب و شاعر منظرِ عام پر آئے وہاں درگا سہائے سرور، چکبست، نظر لکھنوی، اقبال، جگر بریلوی، فراق، محروم، منور لکھنوی، رواں، وحشی کانپوری احسان دانش، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، عزیز لکھنوی، اثر لکھنوی، صفی لکھنوی، مدہوش، کیفی دہلوی، طالب کشمیری وغیرہ جیسے استادانِ فن اور بلند پایہ شعراء کے کلام سے لوگوں کو مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اقبال کا قومی ترانہ جگر بریلوی کی پیام ساوتری اور درگا سہائے سرور کی نظمیں اور پریم چند کے افسانے سب سے پہلے زمانے میں ہی شائع ہوئے۔ اردو ہندی اور ہندستانی پر جگر بریلوی اور دوسرے ادیبوں سے رسالہ زمانہ میں نہایت مفصل بحث کی ہے یہ مضامین زمانہ کے جنوری ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک کے شماروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے، سوامی رام تیرتھ، مولانا شبلی، مولانا حالی، عزیز مرزا وغیرہ کے مضامین بھی زمانہ میں شائع ہوئے ہیں۔ زمانہ کے خاص نمبر بھی نگار کے خاص نمبروں کی طرح اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان نمبروں میں

پریم چند نمبر، حالی نمبر، جوبلی نمبر اور یادگار نمبر خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ رسالہ زمانہ کے بارے میں جگرؔ بریلوی یادِ رفتگاں میں فرماتے ہیں۔

"زمانہ کی چالیس سال کی جلدیں ایسے ایسے بلند پایہ مضامین سے بھری پڑی ہیں جو اردو زبان کے لئے گراں بہا دولت ہیں۔ ادب کا کوئی سنجیدہ شعبہ ایسا نہ ہوگا جس پر نہایت پر مغز مضامین نہ موجود ہوں۔ ادب، شعر، تاریخ، مذہب، تہذیب و تمدن، مصوری، موسیقی، سنگ تراشی، معاشیات، طبیعیات، اثریات، لسانیات، نفسیات، طنزیات، مضحکات، سیاسیات، فلسفہ، اخلاقیات، روحانیت وغیرہ وغیرہ تمام موضوعات پر بڑے بڑے عالموں اور ماہروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر ایک ایک موضوع پر یہ تمام مضامین اکٹھے کر کے کتابی صورت میں شائع کئے جائیں تو اردو کی متعدد علوم و فنون پر بہترین تصانیف کا اضافہ ہو جائے۔ اور شاعری اور انشا پردازی کے بیش بہا مجموعے تیار ہو جائیں حق یہ ہے کہ زمانہ نے کیفیت و کمیت دونوں کے اعتبار سے اردو زبان کی ایسی گرانقدر خدمت انجام دی ہے جس کے بارِ احسان سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اور جس سے ہمیشہ آئندہ نسلیں استفادہ کرتے رہیں گے۔"

زمانہ بابتہ فروری و مارچ ۱۹۴۳ء یادگار نمبر ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر محمد حفیظ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ لٹ کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ رسالہ زمانہ کے سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

"چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زمانہ کی زندگی ایک آئینہ ہے جس میں بڑی حد تک چالیس برسوں کے درمیانی عرصے میں واقع ہونے والے تمام ادبی علمی اور لسانی تغیرات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ زمانہ نے ہر حیات پرور رجحان اور زندگی بخش ادبی اور علمی تحریک کو لبیک کہا اور اس کی نشوونما میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ زمانہ کے صفحات کو نئے خیالات کے طوفان کو روکنے کا اور جدید ادبی کاوشوں کی مخالفت کا منحوس آلہ نہ بننے دیا بلکہ جہاں تک ہو سکا اُن کے اعلیٰ اور بہترین کارناموں کو زمانہ کے صفحات پر نمایاں جگہ دی۔ لیکن ساتھ ہی اُن کی زمانہ شناس نظروں سے یہ حقیقت پوشیدہ

Scanned by CamScanner

نہ تھی کہ مستقبل ماضی سے بالکل علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور ماضی ہی کے بطن
سے مستقبل کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے زمانہ کو کبھی کسی
نوزائیدہ اور فوری جوش کے تحت خوامخواہ ماضی کی اچھی چیزوں کی مخالفت کا
ذریعہ نہ بنایا۔"

اوپر یہ کہا جاچکا ہے کہ منشی دیا نرائن نگم ایک بلند پایہ ادیب تھے انھوں
نے مختلف موضوعات پر بلا مبالغہ سیکڑوں مضامین لکھے جو زمانہ اور دوسرے
رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہاں بعض مضامین سے اقتباسات دیئے
جارہے ہیں جن سے اُن کی قابلیت، موضوع پر قدرت، تحریر کی شگفتگی و دل نشینی
کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ منشی اقبال بہادر ورما سحر کی مثنوی دشینت و
شکنتلا کے تمہیدی نوٹ میں نگم صاحب فرماتے ہیں۔

"شکنتلا" سنسکرت شاعری کا سدا بہار گلاب ہے۔ کالی داس سنسکرت
شاعری کا دل ہے تو شکنتلا اس دل کا دردِ تمنا اور خواب ہے۔ اس کا نام دلوں
میں پاکیزہ، دلکش اور رنگین تصورات کے جگانے کا ایک منتر ہے۔ شکنتلا کا نام
زبان پر آیا اور پردۂ تصور پر ایک تصویر کھنچ گئی۔ کسی درد انگیز حسن اور شباب
کا ایک لبھانے والا خواب پھول کی طرح نازک اور پتی کی طرح کمزور۔

ہرا بھرا جنگل کنول کے پھولوں کا کنج ہرنوں کی کلیلیں، چڑیوں کی خوش نوائیاں
شہد کی مکھیوں کے نغمے اور ہوائے معطر کے جھونکے ان دلفریبیوں کے بیچ میں
شکنتلا اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ بھورے کمل کے پتے پر راجہ دشینت کو خط لکھتی
ہے۔ کتنا دلفریب تخیل ہے کیا شاعر کی فکر رنگین جذبۂ حسن و فراق کی اس سے زیادہ
پر اثر اور پر درد تصویر کھینچ سکتی ہے؟ شکنتلا ایک عورت ہے شعر کی درد کی میٹھے
الاپ کی۔ وہ سیتا کی طرح پاک نہیں، ساوتری کی طرح مستقل نہیں دمن کی طرح
صابر نہیں وہ ایک کمزور ہستی ہے تناور درخت نہیں جس پر ہوائیں اثر نہیں کرتیں
وہ ایک شاخ ہے جو ہواؤں سے ہلتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے۔ یہی اس کی کمزوری
اس کا جوہر ہے اس نے اسے اتنا دلکش بنا دیا ہے۔"

فروری ۱۹۲۸ء میں رسالہ زمانہ کا "جوبلی نمبر" شائع ہوا تھا اس میں حضرت

Scanned by CamScanner

نگم کا ایک مقالہ "یادِ رفتگاں" (ایک نظر بازگشت) کے عنوان سے شامل ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"سچ ہے خدا کا نام رہتا ہے ہمیشہ کچھ نہیں رہتا۔ ہمارے یہ ہمدرد و معاونین جن کو ہم رہ رہ کر یاد کرتے ہیں۔ ہماری امداد و اعانت کے لئے اس عالم علم و عمل میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن ہم کو یقین ہے کہ اُن کا روحانی فیض اس وقت بھی شاملِ حال ہے۔ اُن کی ہمدردی اُن کی دستگیری بیکار نہیں گئی۔ اُن کے کارنامے ہمیشہ یادگار "زمانہ" رہیں گے۔ اور جب تک ادب اُردو کا نام و نشان باقی ہے اُن کے اعلیٰ خیالات پاکیزہ جذبات جو "زمانہ" کی گزشتہ جلدوں میں محفوظ ہیں۔ عزیزانِ وطن کے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے رہیں گے اور شائقینِ ادب اُن کے کارناموں کو فخر اور مسرت سے یاد کریں گے۔ اُن کی مثالیں شمع ہدایت کا کام دیں گی۔ اُن کے نقشِ کلم رہنمائی کا فرض ادا کریں گے اور اُن کی محنت و محبت کی یادگاریں آئندہ نسلوں کو بھی ملک کی ادبی خدمت پر مائل کرتی رہیں گی۔"

اردو پریس کانفرنس کے موقع پر نگم صاحب نے جو خطبۂ صدارت دیا تھا اُس میں اخبار نویسی کے پیشے کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

اخبار نویسی کا پیشہ ایک مقدس اور عظیم القدر پیشہ ہے۔ جو لوگ روپیہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اُنہیں اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ ہاں ملکی خدمت کی اس معزز پیشے میں کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا میدان نہایت وسیع ہے اور ہمت و استقلال اور دیانت سے کام کرنے والوں کو اپنے ضمیر کی خوشنودی اور قلب کا اطمینان حاصل ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی وقعت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ جب ہی ممکن ہو گا جب ہم آرام طلبی کی زندگی کو خیرباد کہہ کر خودداری، ایثار اور مستقل مزاجی سے راہ راست پر چلتے رہیں۔"

آگے ایک جگہ اخبار نویس کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں

"اخبار نویس ایک معمولی اہلِ قلم نہیں ہے اس کا رتبہ بہت بلند ہے"

اس کا درجہ بڑے سے بڑے مدبر نامور سے نامور محب ملک اور مشہور سے مشہور قومی لیڈر سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا اثر بظاہر اتنا نمایاں نہیں ہوتا اور اُس کا رسوخ خاموشی سے بڑھتا رہتا ہے۔ اور سب تعمیری کام کرنے والوں کی طرح اُسے بھی ہر وقت اپنی جگہ پر ایثارِ نفس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سچے اخبار نویس کو تحریر میں وزن اور متانت پیدا کرنا ہوگی اُسے نکتہ چینی کو ذاتیات سے بالاتر رکھنا پڑے گا۔ رائے زنی میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی فکر سے آزاد رہنا ہوگا اور حمایت ہو یا مخالفت، دونوں میں اُسے ہر طرح کے تعصب سے پاک رہنا ہوگا وہ وکالت کرے گا مگر اس کی وکالت میں طرفداری کا شائبہ نہ ہوگا وہ واقعات اور خبروں میں رو رعایت سے کام نہ لے گا۔ دوسرے کے اختلافِ رائے سے بدظن نہ ہوگا۔ اور مخالفین کو اظہارِ رائے کا پورا موقع دے گا۔

منشی دیا نرائن نگم کے مکاتیب کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے[1]۔ یہ مکتوبات اگر شائع ہو جائیں تو یقیناً یہ اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہوگا۔ منشی جی کی خط و کتابت بڑے بڑے نقادوں، ادیبوں، افسانہ نگاروں اور شاعروں سے رہی ہے۔ یہاں حضرت جگر بریلوی کے نام منشی جی کا ایک خط ملاحظہ فرمائیے۔

کان پور

۲۶ر فروری ۱۹۲۱ء

مکرمی تسلیم۔ آپ کے نوازش نامے مع مضمون بھی موصول ہوا۔ آپ کی ہمدردی کا دلی شکر گزار ہوں۔ ابھی تک طبیعت ٹھکانے پر نہیں آئی ہے۔ جنوری نمبر بھی سخت بے اطمینانی کے حالت میں تمام ہوا ہے فروری کے پرچے کا بھی یہی حال ہے۔ آخری کاپیاں کلکتہ سے ہدایت پر تیار کی گئی تھیں۔ چنانچہ معذرت کے نام سے جو نوٹ درج ہے اس کی چند سطروں

---

[1] یہ جولائی ۱۹۸۲ء کی بات ہے گزشتہ سال محمد ایوب واقف نے اُن کے بعض مکاتیب ترتیب دے کر شائع کرا دیئے ہیں۔

Scanned by CamScanner

میں بھی کئی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مدہوش صاحب کے اشعار غلط چھپ گئے ہیں میری توجہ بھی اس طرف نہیں گئی تھی اور کسی ذمہ دار شخص کو دکھائے بغیر یہ رباعی درج ہو گئی ہے۔ آپ کا اعتراض اپنی جگہ پر بالکل درست ہے۔ میں اس توجہ خاص کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ آئندہ پرچہ میں تصحیح ہو جائے گی پہلے مصرع میں "بیٹھے ہو اداس" کی جگہ "بیٹھے ہو عبث اداس" ہے۔ تیسرا مصرع بھی صریحاً غلط ہے "ظلمات کے آگے" کیا نہیں آبِ حیات"۔ بہرحال آپ کی تحریر سے ایسی صریح و فاش غلطی کی اب تصحیح ہو جائے گی۔

آپ کا "مضمون" زمانہ" میں اس عنوان پر اور کئی مضامین کے ساتھ لکھا جا رہا ہے۔ آپ نے جس تحقیق سے مضمون لکھا ہے اس کے لئے میں آپ کو اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ پنشن لے کر کان پور آ جائیں اور ملک کی ادبی خدمت میں مصروف ہو جائیں۔ آپ اس کے اہل ہیں مجھے یہ دیکھ کر آپ کی تمام قابلیت ایسے محکمہ میں صرف ہو رہی ہے جہاں اس کی کوئی پرسش نہیں ہے۔ ہمیشہ افسوس ہوتا ہے لیکن ملک کی ناقدری سے طبیعت اتنی پست ہو گئی ہے کہ آپ کے موجودہ مشاغل ترک کرنے کا مشورہ دینے کی ہمت نہیں پڑتی ہے۔

۱۲؍ اپریل کو ریڈ کراس کے سلسلے میں کان پور میں ایک زبردست مشاعرہ ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس میں ضرور شرکت فرمائیں گے۔ ضابطہ نوید بعد کو حاضر ہوگا امید ہے کہ مزاج مبارک بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص

بندہ دیا نرائن نگم۔

••

پنڈت اندرجیت شرما

میرٹھ ایک زمانے میں علم وادب کے اعتبار سے سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ بیانؔ یزدانی میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، شوکت میرٹھی، ندرت میرٹھی اور پنڈت اندرجیت شرما نے اردو زبان وادب کی جو خدمت کی اس کو اُردو کا کوئی ادبی مورخ اور تذکرہ نویس فراموش نہیں کر سکتا۔ آج اس مقالہ میں پنڈت اندرجیت شرما کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے حالاتِ زندگی اور ادبی خدمات سے ہمارے دورِ جدید کے ادبی مورخ اور تذکرہ نویس تقریباً ناواقف ہوتے جا رہے ہیں۔

پنڈت اندرجیت شرما ۲ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو بمقام کھرکودہ ضلع میرٹھ میں ایک تیاگی برہمن خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اُردو ہندی اور فارسی کی میرٹھ میں حاصل کی۔ ٹریننگ اسکول اور نارمل اسکول کے امتحانات میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہو کر معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۲۲ء میں میٹرک کا امتحان پرائیویٹ طور پر سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۰ء تک ماچھرہ فائنل اسکول میں انگریزی کے اُستاد رہے۔ پھر اسی اسکول میں ۱۹۴۰ء سے ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۶ر جولائی ۱۹۴۶ء کو آپ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ شرما جی نے اُردو کے اساتذہ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور اُن کی صحبتوں سے فیض بھی اُٹھایا تھا۔ طبعاً بڑے سلجھے ہوئے نیک صفت اور وضعدار انسان تھے۔ ساری زندگی ایک سچے سپوت کی طرح اُردو کی خدمت میں لگادی

قرآن مجید کا ہندی ترجمہ کرنے میں خواجہ حسن نظامی کی مدد کی۔ اس کا ذکر خواجہ حسن نظامی نے اُن کے مجموعۂ کلام "نیرنگ فطرت" پر تبصرہ کرتے ہوئے صفحہ ۱۴ پر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میں نے اُن کی صورت نہیں دیکھی مگر انھوں نے میرے دوست چودھری شیو ناتھ سنگھ صاحب ساکن ماچھڑہ ضلع میرٹھ کے ذریعہ مجھے قرآن مجید کا ہندی ترجمہ کرنے میں مدد دی تھی اور میں نے اُن کو اپنے اردو ترجمہ کو ہندی لباس پہنانے میں بہت ہی کامیاب پایا تھا۔"

پنڈت اندرجیت شرما مولانا ندرت میرٹھی کے شاگرد رشید تھے۔ پندرہ سال کی عمر سے ہی شاعری کی طرف رجحان طبع ہو گیا تھا۔ شرما کی شاعری کسی ایک ہی صنف تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے نظم، مسدس، مخمس، غزل گیت وغیرہ میں اپنی طبع خداداد کے جوہر دکھائے ہیں۔ ہمارے بعض ادبی مورخوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ شرما جی کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ حالانکہ شرما کے کلام کے دو مجموعے "نیرنگِ فطرت" اور "جلوۂ زار" شائع ہو چکے ہیں جن کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

"نیرنگ فطرت" اندرجیت شرما کی ادبی، اخلاقی، قومی اور نیچرل نظموں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۰ء میں احسن المطابع میرٹھ سے باہتمام مولانا شبیر احمد صاحب ندرت شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ پر مولانا ندرت میرٹھی خواجہ حسن نظامی اور مولانا عشرت لکھنوی وغیرہ جیسے اربابِ شعر و ادب کی آرا رہیں۔ جس میں انھوں نے شرما کے کلام کو سراہا ہے اور اس مجموعہ کو اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ بتایا ہے۔ یہ مجموعہ نصاب تعلیم میں بھی شامل تھا۔ جناب عبدالشکور صاحب اپنی کتاب "دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعراء" میں صفحہ ۱۲۲ پر اس مجموعہ کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔

"۱۹۲۰ء میں اُن کا کلام "نیرنگ فطرت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے یہ مجموعہ یوپی ٹیکسٹ بک کمیٹی نے مڈل مدارس کے مدرسین کے لئے منظور کیا ہے۔ علاوہ ازیں سی پی اور بمبئی کی حکومتوں نے لائبریریوں اور انعامات کے لئے پسند کیا ہے اس

کی اکثر نظمیں مختلف صوبوں میں کورسوں میں منتخب کی گئی ہیں۔"

اندرجیت شرما کے کلام کا دوسرا مجموعہ "جلوۂ راز" ہے جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ بھی نیرنگِ نظرت کی طرح مقبول ہوا۔ جو احسن المطابع میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں نظمیں، غزلیں اور گیت شامل ہیں۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے "جلوۂ راز" پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کو جدید اردو شاعری میں ایک عمدہ اضافہ بتایا ہے۔

اندرجیت شرما کا رجحان بہ نسبت غزل کے نظم کی طرف زیادہ تھا اور اُن کی نظمیں کافی مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ شرما جی نے ہلکے پھلکے گیت بھی لکھے تھے جو زیادہ تر رکارڈوں میں بھرے جا چکے ہیں۔ اردو گیتوں کی تخلیق کے سلسلے میں حفیظ جالندھری، اندرجیت شرما، مقبول حسین احمد پوری، عظمت اللہ خاں ساغر نظامی، عرش ملسیانی، عدم، شکیل بدایونی وغیرہ نے ہمارے اردو گیتوں کی ہیئت و مواد میں کامیاب اضافے کئے ہیں۔ اندرجیت شرما گیتوں کی تکنیک سے پوری طرح واقف تھے کیونکہ اُنھوں نے سنسکرت اور ہندی کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ عرش ملسیانی کی طرح اُن کے گیت مختلف موضوعات پر ہیں اُن کے گیتوں کی زبان سلیس اور سادہ ہے لیکن ان میں موسیقیت و مٹھاس شامل ہے۔ اور اُن کو ساز پر بآسانی گایا جا سکتا ہے۔ اُن کے گیتوں میں احساس کی شدت بھی ہے اور جذبات کا زور بھی۔ "ادبی دنیا" لاہور کے اڈیٹر مولانا صلاح الدین احمد اگست ۱۹۴۷ء کے "ادبی دنیا" میں صفحہ ۱۴ پر اندرجیت شرما کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے گیتوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"اس ہفتے اڈیٹر "ادبی دنیا" کا بھیجا ہوا ایک ایسا پرچہ ڈاکخانے سے واپس آیا۔ جس پر ڈاکیئے نے پنسل سے لکھا تھا۔ مکتوب الیہ کا انتقال ہو گیا لہٰذا واپس ہے" پرچہ پلٹ کر پتہ دیکھا تو لکھا تھا پنڈت اندرجیت شرما بے اختیار ایک آہ سرد سینے سے نکلی اور فضا میں گم ہو گئی ایک آنسو ٹپکا اور خاک میں مل گیا۔ اندرجیت شرما چل بسے اور اپنے ساتھ وہ رس مٹھاس اور خوشبو بھی لے گئے۔ جو اُنھوں نے اپنے سہانے گیتوں میں بسائی

تھی۔ اردو کو ایسا گیت لکھنے والا مدت تک نہیں ملے گا۔ اور اُن لوگوں کو جو اُنہیں جانتے تھے ایسا سادہ مخلص اور گرم دل دوست قیامت تک میسر نہیں آئے گا۔ وہ ایک عرصہ سے خاموش تھے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ یہ چپ ایک ابدی خاموشی کی پیشرو ہے اور اب اُن کے نغمے اس دنیا کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ اس سازِ سرمدی سے ہم آہنگ ہونے والے ہیں جس کا سرور کبھی کبھی انسانی روح کی گہرائیوں میں سنا جاتا ہے۔ شرما جی کہنے کو مر گئے لیکن جب تک اُن کے گیت زندہ ہیں اور جب تک ہماری دیہاتی دوشیزائیں اُنہیں ندی کے کنارے جھرمٹوں میں گاتی اور شہری دلہنیں اپنی معطر تنہائیوں میں گنگناتی رہیں گی وہ خود زندہ رہیں گے اور ہمیں زندگی سے ہمکنار کرتے رہیں گے"

اندرجیت شرما کا ایک گیت "جوگن اور پپیہا" پیش کیا جاتا ہے۔

سن لے میرا گیت

پپیہے سن لے میرا گیت

جوگن ہوں میں گانے والی　　پریم کا راگ سُنانے والی

پی پی کرنا پریم سے پیارے ہے یہ تیری ریت　　الفت کا ہے جام پپیہے سن لے میرا گیت

پپیہے سن لے میرا گیت

جوگن ہوں میں گانے والی　　پریم کا راگ سُنانے والی

(۲)

میرے من کی بات

پپیہے میرے من کی بات

پی پی کو مجھ کو دکھ بھاری　　پریم کی میرے لگی کٹاری

غم کی سر پہ چھائی گھٹا سی برہن کالی رات　　تیرے من کی بات پپیہے میرے من کی بات

پپیہے میرے من کی بات

پی پی کا تجھ کو دکھ بھاری　　پریم کی میرے لگی کٹاری

(۳)

مجھے وہی بیراگ

مجھے وہی بیراگ

جس کے ہے تو پریم کا پیاسا اس کی ہے اس دل میں لالسا
دونوں ہی کے لگی بدن میں بِرہ کی آگ تجھ کو جو احساس پپیہے مجھے وہی بیراگ
پپیہے مجھے وہی بیراگ
جس کے ہے تو پریم کا پیاسا اسی کی ہے اس دل میں لالسا

اندرجیت شرما کا شمار جدید اردو شاعری کے قابلِ ذکر شعراء میں ہوتا ہے۔ سرور جہاں آبادی کی طرح اُن کی نظموں میں قدیم اور جدید رنگوں کا امتزاج تھا۔ سلاست بیان، چستی، بندش اور پاکیزہ تخئیل اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ اندازِ بیان سادہ و دلکش ہونے کے علاوہ شیریں اور پُراثر ہے۔ اُن کا کلام پڑھنے سے طبیعت کو تازگی اور نفس کو بالیدگی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سعید احمد سعید بریلوی اڈیٹر رسالہ "کامیابی" دہلی نے اپنے رسالہ ماہ جولائی ۱۹۲۰ء کے صفحہ ۳ پر شرما جی کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی۔

"شرما صاحب آہستہ آہستہ اپنے لئے شعرائے ملک کی صفِ اوّلین میں جگہ نکال رہے ہیں۔ اور وہ دن بہت دور نہیں کہ عروسِ کامیابی آپ سے ہم کنار ہوگی۔"

بہارِ حسن کی تصویر دیکھ کر ایک مسدس لکھا تھا اس میں جذباتِ فطرت کا کس سادگی کے ساتھ اظہار کیا ہے کہ طبیعت باغ باغ ہوجاتی ہے کیا خوب کہتے ہیں۔

ہائے یہ موسم گلوں کا ہائے یہ عہدِ شباب بے پئے رگ رگ میں ہے کیفیتِ جامِ شراب
مست ہوکر گا رہی ہیں کیا حیا کیسا حجاب تالیاں یہ کیا ہیں بجتا ہے ہتھیلی کا رباب

زندگی کا لطف جھولے میں ہے یا گلشن میں ہے
فصلِ گل میں ننھی ننھی بوندوں میں ساون میں ہے

مفلسوں کی ہولی میں ہندوستانیوں کی غریبی کی کیسی دردناک تصویر کھینچی ہے۔ جب بھارت پر انگریزوں کا راج تھا۔

Scanned by CamScanner

سب اہلِ ہند مست ہیں جامِ خیال میں
گاتے ہیں مرد و زن سبھی ہولی کا راگ آج

ہے پیٹ کو اناج نہ کپڑا بدن کو ہے
ہر شخص کھیلتا ہے لنگوٹی میں پھاگ آج

"ہندو مسلم" ایک مسدس لکھا ہے اس میں ہندو مسلمان کے اتحاد پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

وہ طائر ہیں کہ جن کی عمر گزری اک نشیمن میں
مکیں ہیں وہ کہ ہیں رشکِ جناں کی ایک مسکن میں
وہ گُل ہیں جن کی بو پھیلی ہوئی ہے ایک گلشن میں
وہ پتلے ہیں نہیں کچھ فرق جنکے رنگ و روغن میں
مگر افسوس نا واقف ہیں اب تک رازِ فطرت سے
اُٹھانا فائدہ سیکھا نہیں کچھ درسِ عبرت سے

نظم "برسات کی فضا" "دوشیزۂ صحرائی" اور "مرغزار" میں جن جذباتِ عالیہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ حقیقت میں اندر جیت شرما کا ہی حصّہ ہے نظم "برسات کی فضا" کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

آسماں پر چھا گئی کالی گھٹا برسات کی
ٹھنڈی ٹھنڈی خلد سے آئی ہوا برسات کی

زاہدوں کے دل میں بھی پیدا ہوئی مستی کی لہر
سوتے فتنوں کو جگاتی ہے ہوا برسات کی

ہر طرف کہسار پر طاؤس محوِ رقص ہیں
باغ میں کوئل کی کو کو ہے نوا برسات کی

برق بن کر جلوۂ قدرت ہوا ہے بے حجاب
پانی پانی شرم سے ہو گی گھٹا برسات کی

گل کھلے گلزار میں یا آئیں پریاں خلد سے
یا قیامت ڈھا گئی کالی گھٹا برسات کی

بھول کر جنّت کا طالب نام جنّت کا نہ لے
دیکھ لے اک بار اگر آکر فضا برسات کی

کیوں تر و تازہ نہ ہوں برسات میں نظم کہن
کر گئی سب کو ہرا کالی گھٹا برسات کی

نظم جگنو جس بحر میں لکھی گئی ہے وہ بحر اردو میں کم مروج ہے۔ البتہ عربی اور فارسی میں اس کا رواج بہ کثرت ہے۔ دو بند ملاحظہ فرمایئے

برسات کی یہ شب ہے تاریک جہاں ہے
پڑتی ہیں جہاں نظریں اک ہو کا سماں ہے
کیا زیرِ فلک گردوں بادل کا عیاں ہے
وہ بزم فلک بھی اب پردہ میں نہاں ہے
ہے دل‌کش ہوا لیکن اک طور کا عالم
چھایا ہوا صحرا میں ہے نور کا عالم

چنگاریاں اڑتی ہیں خاموش فضا میں
یا سوز ہیں یہ رقصاں ظلمت کی قبا میں
یا شانِ مسیحائی چھن چھن کے گھٹا میں
ذروں کو اڑاتی ہے پر دے کے ہوا میں
یا چرخ پہ بادل کے چمکتے ہیں ستارے
یا برق تجلی کے گرتے ہیں شرارے

نظم "گنگا" ملاحظہ فرمایئے کیا خوب فرماتے ہیں۔

کوہِ ہمالیہ ہے گنگا ترا نشیمن
پھیلا ہوا ہے اس کی گودی میں تیرا دامن
دنیا میں تو رواں ہے جنت میں اور رواں ہے
تیرا زمیں پہ جوبن ہے آسماں پہ جوبن
قدرت نے آبِ شیریں تجھ کو عطا کیا ہے
شاداب جس کے دم سے بھارت کا ہے یہ گلشن
کہتی ہے ساری دنیا کہتا ہے سارا عالم
پانی ترا نہیں ہے آبِ حیات سے کم

تقدیر سے میسر جس کو تری فضا ہے
تیرا ہی دامن اس کو آغوشِ دل کشا ہے
گنگا بنکے جوگی بیٹھا ترے کنارے
حسنِ ازل کا جلوہ موجوں میں دیکھتا ہے
آبِ رواں سے ایسی لو اس کی لگ رہی ہے
گویا کہ محو ہو کر تصویر بن گیا ہے
اک جام وصل تیرا مل جائے وقت آخر
یہ زندگی سپھل ہو مرنے کا ہے مزہ پھر

اندرجیت شرما نے چکبست کی طرح غزلیں بہت کم لکھی ہیں۔ لیکن اس صنفِ سخن میں بھی وہ جو کچھ کہتے ہیں، اس میں بڑی جان ہوتی ہے۔ فنی حیثیت سے غزل کی قدیم روش کے پابند ہیں لیکن خیالات کے لحاظ سے اُن کی غزل سوقیت و ابتذال سے پاک ہے۔

Scanned by CamScanner

ہر شے میں ترا یارب جلوہ نظر آتا ہے
جس کوہ پہ جاتا ہوں سینا نظر آتا ہے

تو آئینۂ دل کو کر صاف تکدر سے
اس آئینہ میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے

معلوم یہ ہوتا ہے بس فرق جز و کل ہیں
قطرہ کی بے مجھے تہہ میں دریا نظر آتا ہے

ہستی کے سفینے کو ساحل سے کہاں حاصل
دریائے فنا میں یہ ڈوبا نظر آتا ہے

سینے میں تڑپتا ہے ارماں ترے ملنے کا
لیکن اسے کب کوئی رستہ نظر آتا ہے

ظہارِ غم کا بعد کو سودا کرے کوئی
پہلے اثر کی راہ تو پیدا کرے کوئی

وقِ نظر کے ضبط کا ہے اقتضا یہی
کچھ دل کے آئینہ ہی میں دیکھا کرے کوئی

یا پیامِ ہوش پیامِ اجل کے ساتھ
کیا خاک زندگی کی تمنا کرے کوئی

رواز کا تو بعد میں ہوتا ہے امتحاں
در تو قفس کا پہلے ذرا وا کرے کوئی

کھل گیا معمہ حیات و ممات کا
اک انقلاب زیست میں پیدا کرے کوئی

قیقت سے یہ مانا دور ہوں میں
محبت میں مگر مسرور ہوں میں

ی فطرت ہے وقفِ خاک ساری
تکبر کے سبب منصور ہوں میں

انہ پر حکومت چاہتا ہوں
مطیع نفس ہوں مجبور ہوں میں

راقت کی ضیا پاشی ہوئی جب
تو دیکھا جہل میں مستور ہوں میں

ے بھاتا نہیں جنت میں رہنا
گنا ہوں میں بہت مشہور ہوں میں

نگی لپٹی نہیں رکھتا کسی کی
بہت بیباک ہوں مغرور ہوں میں

رخ کہن کے جور سے تنگ آ گئے ہیں ہم
یارب کوئی اب اور نیا آسماں بنا

ے وفا نہیں ہے تو کس کام ہے پھول
اچھا تو ہے وہ خار جو دامن کشاں بنا

ب آنسوؤں سے ہوئی کشتِ آرزو
برباد ہو کے خرمنِ دل گلستاں بنا

ے مذہب میں کہاں نقشِ دوئی کا نام ہے
طالبِ گل کو چمن میں خار سے کیا کام ہے

Scanned by CamScanner

میرا بس ہو تو مٹا دوں سارا رنگِ امتیاز — قصۂ دیر و حرم تو اک خیالِ خام ہے

کعبۂ دل کی پرستش میں ہے روحانی طرب — ماسوا کہتے ہیں جس کو مجمعِ آلام ہے

ہے منور دل کا کاشانہ خدا کے نور سے — صبحِ صادق سے ہے روشن تر وہ اس کی شام ہے

صاحبِ ہمت نہیں ڈرتے ہیں مرنے سے کبھی
موت کیا اُن کے لئے ہے زیست کا پیغام ہے

یہ آرزو ہے دل میں تری آرزو رہے — اس گھر میں کوئی بھی نہ رہے تو ہی تو رہے

دل میں ہجومِ یاس کی کچھ انتہا نہیں — گھر میں جگہ بھی ہو جو تری آرزو رہے

لائے گا رنگ خونِ محبت کبھی ضرور — اے گل نہ تو رہے نہ تری رنگ و بو رہے

پینے کا جب مزہ ہے کہ آ جائے وہ خمار
رگ رگ میں موجِ مے ہو نہ باقی لہو رہے

●●

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

انگریزی زبان کے ذریعے اُردو ادب کی خدمت کرنے والوں میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اُن کی ادبی خدمات پر ہمارے ادبی مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل اُن کو بھولتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایک اعلیٰ سکسینہ کایستھ خاندان کے فرد تھے طالب علمی کے زمانے ہی سے علم و ادب کا شوق اُن کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا۔ اُنھوں نے ۱۹۱۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کا امتحان نہ صرف اوّل درجے میں پاس کیا بلکہ یونیورسٹی میں سب سے اوّل آئے تھے۔ اسی سال ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کیا اور اس میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ اور یونیورسٹی بھر میں پہلے کی طرح پھر اوّل رہے۔ اسی سال ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے لئے نامزد کئے گئے۔ آپ نے ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں گورنمنٹ برطانیہ کے سرکاری عملے کے ساتھ شرکت کی اور اس سلسلے میں سارے یورپ کا دورہ کیا۔ پھر دوبارہ ۱۹۳۸ء میں یورپ کی سیر کی اور زبان کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے ملے۔ حکومت ہند اور حکومت یو پی میں بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ آگرہ یونیورسٹی نے ۱۹۴۴ء میں آپ کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری تفویض کی آپ ہندوستانی اکیڈمی کے بانیوں میں تھے۔ رابندرناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو اور

کے ایم پانیکار کے ساتھ انگریزی لٹریچر کی پی۔ای۔این سوسائٹی کے رکن رہے آپ نے ۱۹۴۸ء میں آل انڈیا رائٹرس کانفرنس کی صدارت بھی کی تھی۔ "ورلڈ اورنٹیلسٹ کانفرنس" (عالمی مستشرقین کانفرنس) برسیلز کی سب کمیٹی کے ۱۹۵۱ء میں چیرمین بھی رہے۔ ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر کے انتقال کے بعد ساہتیہ اکیڈمی میں اردو کے نمائندے کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے اردو کے اعلیٰ امتحانوں کے ممتحن بھی رہے آپ نے بے شمار مشاعروں اور ادبی کانفرنسوں کی صدارت بھی کی۔

رام بابو سکسینہ ہندوستانی مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے تھے کہ میرٹھ اسٹیشن پر انہیں قلبی دورہ پڑا۔ اور ۲۲ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو حرکت قلب بند ہو جانے پر وہ انتقال کر گئے۔ اُن کی وفات کی خبر سن کر ہندوستان کے ادبی اور علمی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ اور سبھی علاقائی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے آپ کی ناگہانی موت کو ہندوستانی ادب کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ بتایا۔ تلوک چند محروم نے اُن کی وفات سے متاثر ہو کر تین رباعیاں کہیں۔ جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

یک جا اہلِ وطن کو اُردو نے کیا
یہ کام نہ مسلم نے نہ ہندو نے کیا
اُردو کا ہے تنظیمِ وطن پر احساں
احساں اُردو پہ یہ رام بابو نے کیا

اُردو ہے جسے پسند باپو نے کیا
باپو نے جو کہا تو نہرو نے کیا
اردو ہے اگر محسنِ تہذیبِ وطن
احساں اردو پہ رام بابو نے کیا

اقوامِ وطن کو رام اُردو نے کیا

Scanned by CamScanner

جادو سا اس زبان دل جو نے کیا
کیا خوب لکھی ہے اسکی دلکش تاریخ
احسان اردو پہ رام بابو نے کیا

پروفیسر آلِ احمد سرور یکم جنوری ۱۹۵۸ء کے "ہماری زبان" میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے انتقال پر رقم طراز ہیں۔

"ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اُردو کی بڑی خدمت کی تھی۔ وہ نہ صرف تاریخ ادب اردو کے مصنف تھے۔ بلکہ اُن کے قلم سے "انڈو یورپین شعراء" جیسی بلند پایہ کتاب بھی نکلی تھی۔ حال میں انھوں نے "مرقع شعراء" اور "مثنویاتِ میر بخط میر" بھی شائع کی تھی۔ انگریزی میں میر پر بھی ایک کتاب تیار کر لی تھی۔ اس کے علاوہ اشاریت پر عرصے سے ایک ضخیم کتاب کی تیاری میں مصروف تھے جس کے لئے انھوں نے ہر زبان سے اس قسم کا مواد یکجا کیا تھا۔ باوجود سرکاری ملازمت کی مصروفیات کے وہ ساری عمر ادب کے مطالعے، تحقیق و تنقید میں لگے رہے اور اب ملازمت کی فکر سے آزاد ہو کر ہمہ تن اسی کام میں مصروف تھے۔ اُن کے جوش لگن اور استقلال سے امید تھی کہ وہ اردو ادب میں اور گراں قدر اضافہ کریں گے مگر اس اچانک موت نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی عمر ساٹھ سال سے کچھ ہی تجاوز رہی ہو گی۔ اُن کی مجموعی صحت بہت اچھی تھی اور کسی کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اتنی جلد ہم سب کو چھوڑ کر دوسری دنیا کا رخ کریں گے۔ اُن کی اس بے وقت موت سے اردو ادب کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔"

سید احتشام حسین آج کل بابتہ مارچ ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی یاد میں اپنا مضمون ان الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

"ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی زندگی میں مجھے جو قابلِ تقلید خصوصیات نظر آئیں اُن میں اُن کی انتھک محنت بھی شامل ہے۔ وہ اب بھی کسی کسی دن اٹھارہ گھنٹے لکھنے پڑھنے میں گزار دیتے تھے۔ اور جس وقت تک اپنا کام مکمل نہیں کر لیتے تھے انہیں چین نہیں آتا تھا۔ لگن کے ساتھ ادبی کام کرنے کی خصوصیت ہماری نسل

Scanned by CamScanner

سے مفقود ہوتی جارہی ہے۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ اب کوئی دوسرا رام بابو سکسینہ پیدا نہ ہوگا۔ اور اردو ادب کے پرستاروں میں ان کی جگہ خالی رہے گی"

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی جو تصانیف اب تک شائع ہو چکی ہیں ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

(۱) تاریخ ادب اردو:۔ یہ ۱۹۲۷ء میں انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی اس کا اردو ترجمہ نولکشور پریس نے پہلی بار ۱۹۲۹ء میں شائع کیا۔ تاریخ ادب اردو کا پیش لفظ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے سپردِ قلم کیا۔ اور اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری نے کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترجمہ ایسا ہے کہ مترجم کی بجائے عسکری صاحب کو کتاب کا مرتب کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ تاریخ ادب اردو کا پہلا حصہ نثر سے اور دوسرا نظم سے متعلق ہے۔ کتاب میں متعدد تصاویر بھی دی گئیں ہیں۔ ہندی میں بھی۔ تاریخ ادب اردو دو جلدوں میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اردو اور ہندی کے علاوہ فرانسیسی، جرمنی، روسی اور فارسی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرورؔ علی گڑھ "تاریخ ادب اردو" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔

"اردو ادب کی سب سے پہلی تاریخ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے ۱۹۲۷ء میں انگریزی میں لکھی جس کا ترجمہ اضافے کے ساتھ مرزا محمد عسکری نے اردو میں کیا اور نولکشور پریس لکھنؤ نے اسے شائع کیا۔ یہ تاریخ اب خاصی تشنہ معلوم ہوتی ہے اور اس کے بہت سے خیالات موجودہ حالات کی روشنی میں درست نہیں کہے جا سکتے۔ پھر بھی اس کی اولیت اور ایک حد تک افادیت مسلم ہے۔ اس میں سب سے پہلے نظم و نثر کے تمام اہم اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے اور ایک مجموعی تصویر پیش کی گئی ہے۔

(۲) اردو اور فارسی کے یوروپین اور اینگلو انڈین شعراء: ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب صرف انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ یہ ایک ضخیم تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے۔ جس میں یوروپین اور اینگلو انڈین شعراء کے کلام مع حالاتِ زندگی درج کیے گئے ہیں۔ اس میں اردو کے

علاوہ اُن شعراء کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ تاریخ ادب اردو کی طرح یہ کتاب بھی ہمارے ادب میں ایک کامیاب اضافہ ہے۔

(۳) مرقع شعراء۔ اس کتاب میں دس شاعروں کے حالات زندگی مع سہ رنگی قلمی تصویر و نمونہ کلام پیش کئے گئے ہیں۔ اس کی اشاعت ۱۹۵۰ء میں عمل میں آئی۔ کتاب کے مؤلف کا نام واضح نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے پیش لفظ میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ ایک سکینہ کا نسخہ تھے۔ بعض دوسرے محققین کے خیال میں یہ رام بابو سکسینہ ہی تھے۔ تذکرے کی زبان فارسی ہے۔ اس میں جن شاعروں کے حالات زندگی اور تصویریں موجود ہیں اُن کے نام یہ ہے۔

(۱) راجہ جسونت سنگھ پروانہ لکھنوی۔ (۲) رائے ٹیکا رام تسلی لکھنوی۔ (۳) جعفر علی حسرت دہلوی (استاد جرأت) (۴) میر ضیاء الدین ضیا دہلوی۔ (۵) لکمند لال فدوی لاہوری۔ (۶) دیوانی سنگھ قتیل فریدآبادی۔ (۷) شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی (۸) کنور سین مضطر لکھنوی (۹) مرزا جان جاناں مظہر دہلوی اور (۱۰) میر تقی میر۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش لفظ میں "مرقع شعراء" کے سلسلے میں تحریر فرمایا ہے۔

"اگر تذکرہ کے ان اوراق میں اور کچھ نہ ہوتا صرف میر تقی میر اور حضرت مظہر کی تصویریں ہی ہوتیں جب بھی ان کی غیر معمولی قدر و قیمت کا اعتراف کرنا پڑتا"

(۴) مثنویات میر بخط میر:۔ اس کتاب میں میر تقی میر کی چار مثنویاں شامل ہیں جن کے نام یہ ہیں :۔ (۱) "مثنوی عشقیہ"۔ (۲) "جنگ نامہ" (نواب آصف الدولہ اور روہیلوں کی جنگ۔ یہ مثنوی میر کے کلیات میں شامل نہیں ہے) (۳) "مثنوی دربیان ہولی"۔ (۴) "مثنوی دربیان مرغ"۔ یہ سب سے پہلی کتاب ہے جس میں میر تقی میر کا نمونہ خط منظر عام پر آیا ہے۔

میر صاحب سے جو عقیدت اہل ادب کو ہے اس کے پیش نظر مثنویاں ہمارے ادب میں ایک اضافہ ہیں۔ کیونکہ یہ خود میر صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یہ مثنویاں ۱۱۹۳ ہجری کے قریب لکھی گئیں تھیں۔ یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی

ڈاکٹر صاحب کی انگریزی تصانیف جو اردو ادب سے متعلق ہیں اور شائع نہ ہوسکیں۔ وہ یہ ہیں۔

Scanned by CamScanner

(۱) جدید اردو ادب (دو جلدیں) (۲) اردو اور فارسی کے شاعروں
کا کلام ہندی زبان میں۔ (۳) اردو ادب پر وہ مضامین جو پی ایم ایل اے
ین میں شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔ (۴) سمبالزم اور
لٹریچر۔ یہ انگریزی میں ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ایک کتاب ہے (۵) ماڈرن اردو
پوئیٹری یہ کتاب بھی انگریزی زبان میں ہے۔

انھوں نے غالبؔ، انیسؔ، میرؔ، سرور جہاں آبادی جیسے باکمالوں پر انگریزی
میں کتابیں لکھنا شروع کر دی تھیں جو اُن کی اچانک موت ہونے کے سبب
نامکمل رہ گئیں۔

"مرقعِ شعرا" اور "مثنویاتِ میر بخطِ میر" پر رسالہ آج کل مئی ۱۹۵۸ء میں
اظہارِ خیال کرتے ہوئے اثر لکھنوی لکھتے ہیں۔

"الغرض دونوں کتابیں نایاب ہیں۔ اور اُن کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے
اُن سے ہماری معلومات میں معقول اضافہ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں دونوں نسخوں
کی کتابت اور طباعت اس قدر دیدہ زیب ہے کہ بس آدمی دیکھتا رہے۔ بلاخوف
تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اس شان کی کتابیں اس اہتمام سے آج تک
شائع نہیں ہوئی تھیں"۔

ان کی سب سے پہلی کتاب "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" ملک میں اور
بیرونِ ملک بہت مقبول ہوئی۔ بیرونِ ملک اردو کو روشناس بلکہ مقبول کرانے
میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تنہا یہی کتاب ان کو حیاتِ جاوید
بخشنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس میں ایک بہت بڑی کمی رہ گئی ہے جس کی وجہ سے اس
کی مقبولیت و حیثیت کو بڑا نقصان پہنچا وہ کمی یہ ہے کہ اردو کی تخلیق، تشکیل، ترقی و ترویج
میں ہندوؤں کی وقیع اور گراں قدر خدمات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جبکہ انھوں نے
بھی دوسروں کے بالمقابل اردو کی کچھ کم خدمات انجام نہیں دی ہیں۔ چکبستؔ اور
نظرؔ کو کتاب کے مترجم مرزا محمد عسکری نے شامل کر کے اس کمی کی قدرے تلافی کر دی
اور واضح ہو گیا کہ ہندو اہلِ کمال کو سکسینہ صاحب نے ارادتاً ترک کیا تھا۔ جب
اس حق تلفی کی طرف ان کو متوجہ کیا گیا تو انھوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور کہا کہ

اب ایک دوسری کتاب (Modern Urdu Poets) جدید اردو شعرا لکھنے والا ہوں اس میں تلافی کر دونگا۔ ان کی دوسری کتاب "یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اُردو" بھی تاریخ ادب اردو کی طرح دوسرے ملکوں میں بہت مقبول ہوئی۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا شمار ہمارے معتبر نقادوں اور ادیبوں میں ہوتا تھا۔ وہ انگریزی کے پہلے ہندوستانی ادیب تھے جو اردو کے سلسلے میں انگریزی میں کتابیں لکھنے کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ ہمارے ملک کے نقادوں میں سر تیج بہادر سپرو، پروفیسر آلِ احمد سرور، جگر بریلوی اور پروفیسر احتشام حسین نے رام بابو سکسینہ کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی رائے کا اوپر ذکر آچکا ہے۔

اردو زبان کے بعض ادیبوں اور نقادوں کا یہ خیال ہے کہ انھوں نے اردو میں رام بابو کی ایک سطر بھی کہیں نہیں دیکھی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے سکسینہ صاحب نے کانفرنسوں کے موقعوں پر جو پیغامات دیئے اور خطبات پڑھے ہیں وہ اردو میں ہی ہیں۔ آپ اردو میں شاعری بھی کرتے تھے۔ تخلص رونق تھا۔

آپ کی ایک غزل 'زمانہ' اگست ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے

مری محفل میں کل وہ ماہ رو جب بے نقاب آیا
فلک پر ماہ شرمایا گہن میں آفتاب آیا

چھپی ہے سر میں آنکھوں میں جگر میں دل میں سینے میں
تمہاری تیغ عریاں کو مگر کیا ہی حجاب آیا

مرے نالوں سے کس کس دل میں چھالے پڑ گئے ظالم
ستارے آسماں پر آئے دریا میں حباب آیا

عیاں ہے مردم آبی نے کی ہے ترک مے خواری
دلیل اس کی یہ ہے الٹا ہوا جام شراب آیا

بپا اک ہوگیا طوفاں جو آئی بات رونے کی
تڑپ کر گر پڑی بجلی جو ذکر اضطراب آیا

نشیلی آنکھ ہی سے ہو گئے مدہوش ہم ساقی
مئے ساغر کی حاجت کیا جو وہ مستِ شباب آیا
بڑھایا چشمِ تر نے اس قدر طوفانِ گریہ کو
کہ یہ گردونِ گرداں بھی نظر مجھ کو حباب آیا
مگر فردوس سے زیادہ کہیں آرام ہے اس کو
ترے کوچہ میں چشمِ نقشِ پا کو کیا ہی خواب آیا
یہاں توحید کا جلوہ نظر کس طرح سے آتا
کہ واں اللہ کا کشیدہ ہی بن کر نقاب آیا
جو چیدہ تھے زمانہ کے تو رونق وقتِ قسمت بھی
ہمارے حصے میں آیا جو غم وہ انتخاب آیا

اردو مضامین کے کچھ اقتباس بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ جس سے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی اردو نثر نویسی میں درک کا اندازہ ہو جائے گا۔ اور یہ خیال غلط ٹھہرے گا کہ انھوں نے اردو میں ایک سطر بھی نہیں لکھی۔

راجستھان اردو کانفرنس کے موقع پر انھوں نے جو پیغام بھیجا تھا نقوش کے شخصیات نمبر حصہ ۲ صفحہ ۹۸۹ سے اس کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

" اردو کو ہندی سے دشمنی یا رقابت نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے کہ ہندی ہندوستان کی زیادہ آبادی کی زبان ہے اگر اسے عالمگیر ہوتا ہے تو یہ صرف اس حالت میں ممکن ہے کہ اردو اس کی مدد کرے اور شریک کار ہو۔

اردو کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ محلوں کی پیداوار نہیں بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے۔ عام لوگوں نے اسے پالا پوسا ہے اور دونوں قوموں نے مل کر اسے پروان چڑھایا ہے۔ اردو اس ملک کی پیداوار ہے باہر سے اس کی کھیپ نہیں آئی لیکن بدلتے ہوئے حالات میں اسے اپنی بقا کے لئے نئے نئے خیالات کو اپنے میں جذب کرنا اور اُن کا ساتھ دینا چاہیئے۔ خود اپنی بے پایاں طاقت پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اس کے پس منظر میں ہندوستانی روایات ہیں اسے عام لوگوں سے علیحدگی اختیار نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اُن سے

ریب تر ہونا چاہیے۔ ایسی میٹھی سریلی، چلبلی اور کس بس رکھنے والی زبان
د متروک یا تہس نہس نہ ہونا چاہیے۔

اردو کا ادب سریلا ہے جس سے دل کا کنول کھل جاتا ہے۔ اس کا خزانہ
بھرا پڑا ہے جس میں موتی، یاقوت، ہیرا، زمرد اور نہ معلوم کتنے رنگوں کے
واہر ہیں۔ ان کو یقیناً تلف ہونے سے بچایا جائے گا۔"

یوم برق ۱۹۵۶ء کا خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے آپ منشی مہاراج
بہادر برق مرحوم کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"جدید اردو ادب میں مہاراج بہادر برق ایک ممتاز مقام رکھتے تھے
اپنے زمانے کے صفِ اوّل کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک انسان کی
یفیت سے بھی اُن کی ہستی عظیم تھی۔ وہ اپنی عظیم شاعرانہ صلاحیتوں یکمیل
ن حسنِ ذکاوت، خداداد استعداد اور زبان و بیان پر حیرت انگیز مہارت
کھنے کے باعث افقِ اردو پر آفتاب عالم تاب بن کر چمکے۔

آپ کا کلام حسنِ سلاست کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ کی نظمیں جذبات
یہ، موزوں تشبیہات واستعارات، نفیس خیالات اور نزاکت بندش کے
ہردل سے مملو ہیں۔ آپ نے مختلف موضوعات پر کامیابی کے ساتھ قلم اٹھایا
۔ آپ کے موضوعات میں حب الوطنی، تاریخ، مناظرِ قدرت، اخلاقیات
دینیات شامل ہیں۔ آپ کی بیانیہ شاعری بھی بیحد قابلِ قدر ہے۔ آپ
مختلف تہواروں سے متعلق نظمیں کہی ہیں۔ جن میں ہندی الفاظ کا استعمال
یت برمحل اور فن کارانہ صلاحیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وہ آج بھی مسلمہ
۔ مختصر یہ کہ مہاراج بہادر برق کا نام ایک ایسا نام ہے جسے کبھی
موش نہیں کیا جاسکے گا۔ وہ اپنے زمانے کے ایک پیشوا تھے جن کی عظمت
ش کبھی دھندلا نہیں پڑ سکتا۔

ہندوستان اور دوسرے ممالک کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں
سکینہ صاحب کے تعلقات رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اُن کے خطوط
ا مجموعہ شائع کیا جائے جو انھوں نے قابلِ ذکر ادیبوں، شاعروں

اور نقادوں کو لکھے ہیں ۔ یہاں اُن کے دو انگریزی خطوط کا ترجمہ دیا جا رہا ہے ۔ جو انھوں نے حضرت جگر بریلوی کو لکھے تھے ۔

مال روڈ آگرہ

۲۰ر جنوری ۱۹۴۲ء   مائی ڈیر جگر صاحب

آپ کا خط ملا ۔ آپ کے اس اندوہ ناک حادثہ سے مجھے بیحد صدمہ پہنچا اور رنج ہوا ۔ اس جانکاہ اور دلخراش غم میں میرا دل آپ کے ساتھ ہے یا کوئی اور شخص کیا کہہ سکتا ہے ۔ الفاظ آپ کے اس بھاری غم میں کوئی تسکین نہیں دے سکتے سوا ضبط کے ہم کو چارہ نہیں ۔ ہماری ناہموار زندگی ان مصائب سے معمور ہے ۔ بس مشیت ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے ۔ پروردگار آپ کو تسکین کا مرہم ارزانی سے مرحمت فرمائے ۔

ایسی حالت میں بہتر تو یہی ہے کہ ادب میں زیادہ مشغولیت ہو ۔ آپ اپنے اعلیٰ تصنیف کا کام انہماک کے ساتھ تکمیل کو پہنچائیں

بہ حیثیت ایک بلند پایہ شاعر و مصنف کے آپ کی ایک مستقل جگہ ہے ۔ ادبی تخلیق ہی وہ چیز ہے جو اس مختصر زندگیوں اور بے ثباتیوں کی دنیا میں قدر و قیمت رکھتی ہے باقی سب ہیچ ہے ۔ میں اس دن کا منتظر ہوں جب آپ سے مل سکوں ۔

التفات آمیز تعظیم کے ساتھ

آپ کا شریکِ غم ــــ رام بابو سکسینہ

بوچیپ ولا ۔ نینی تال

۱۱ر جون ۱۹۵۶ء   مائی ڈیر جگر صاحب

آپ کے جون ۱۹۵۶ء کے نامۂ عطوفیت و محبت کا بہت بہت شکریہ اور قطعے کے عطیہ کا بھی ۔ میرے لئے یہ دوگونا خیر مقدم کا باعث ہے اس لئے کہ آپ نے ایسے وقت لکھا جب آپ بہترین صحت میں نہیں ہیں ۔ میں بڑے شوق سے اسے دل میں جگہ دونگا اور اس کی قدر کروں گا ۔

میں نے آجکل میں آپ کی مثنوی "پیام ساوتری" پر تعریفی تنقید بڑی دلچسپی سے پڑھی میں اسے بہترین رنگ کا ایک جواہر سمجھتا ہوں اور آپکے شاہکار اپنی کتاب "جدید اردو ادب" میں اس پر تبصرہ کروں گا ۔

التفات آمیز تعظیم اور دوبارہ شکریہ قبول ہو ــــ   آپ کا ۔ بندۂ محبت
رام بابو سکسینہ

کرشن سہائے ہنتکاری وحشی

کرشن سہائے ہنتکاری وحشی تخلص، وطن کانپور۔ والد کا نام منشی چندی سہائے تھا جو ایک اعلیٰ سری واستو کائستھ خاندان کے فرد تھے اور محکمۂ پولیس میں سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ وحشی صاحب کی ولادت سمبت ۱۹۴۱ بکرمی یعنی ۱۸۸۴ء میں فتح پور میں ہوئی۔ آپ کے دادا منشی گنگا سہائے مختار عدالت تھے اور فتح پور ہی میں وکالت کرتے تھے۔ آپ کے خاندان میں ہر شخص کو فارسی سے ذوق تھا اس لئے آپ کی ابتدائی تعلیم بھی فارسی میں ہوئی۔ اور ۱۳ یا ۱۴ سال کی عمر تک اس زبان کی شیرینی کے مزے لیتے رہے اور کسی زبان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ آپ چاہتے تھے کہ اردو مڈل کلاس میں داخل ہو جائیں لیکن اسکول میں کوئی مڈل کلاس میں داخل کرنے کے لئے تیار نہ ہوا کیونکہ فارسی کے علاوہ آپ کسی زبان کو نہیں جانتے تھے۔ بالآخر اس شرط پر داخل کر لیے گئے کہ اگر امتحان کے وقت امتحان پاس کرنے کے قابل سمجھے جائیں گے تو امتحان میں شریک ہو سکیں گے ورنہ نہیں۔ امتحان کے تین ماہ باقی تھے۔ اس درمیان میں آپ نے ارتھمیٹک اور دو مقالے اقلیدس کے معہ مشقوں کے ختم کر ڈالے اور درجہ میں فرسٹ رہنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مڈل کے امتحان میں نہ صرف اول آئے بلکہ ہر سبجیکٹ میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ اب آپ کو خیال ہوا کہ تھوڑی بہت انگریزی پڑھ کر کسی انگریزی اسکول میں نام لکھائیں۔ چھ ماہ تک انگریزی کا مطالعہ گھر پر کیا اور پھر آپ کا داخلہ ساتویں درجہ میں ہو گیا۔ اس کے بعد تین سال کی مدت میں فرسٹ ڈویزن میں آپ نے انٹرنس پاس کر لیا اور انگریزی میں کافی استعداد حاصل کر لی۔

Scanned by CamScanner

ہتکاری تحصیلِ علم میں مشغول تھے کہ اُن کے والد نے اپنی نوکری سے دل برداشتہ ہو کر سبک دوشی حاصل کرلی اور خانہ نشین ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین بھائیوں کی تعلیم، چار بہنوں کی شادی اور والدین کی پرورش کا سارا بار وحشی صاحب پر آگیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں تعلیم کا سلسلہ کیسے جاری رہتا۔ وحشی صاحب کو مجبوراً ایک اسکول کے ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کرنا پڑی اور باقی وقت پرائیویٹ ٹیوشن میں صرف کرنا پڑا۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ آپ کسی طرح قانون کا امتحان پاس کرلیں آخر ۱۹۰۶ء میں کمرِ ہمت باندھی اور سب کام چھوڑ کر وکالت کا امتحان دینے کی تیاری شروع کردی۔ اسی سال امتحان پاس کرلیا۔ اور ۱۹۰۷ء سے کانپور میں وکالت شروع کردی۔ بعد میں ۱۹۲۴ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ بھی ہو گئے۔

آپ کی اہلیہ کا ۱۹۲۲ء میں انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ اُن کے لئے بڑا جاں کاہ تھا مگر یہی حادثہ اُن کی شعر گوئی کا محرک بنا۔ اپنے خود نوشت قلمی حالات میں رقمطراز ہیں۔[1]

"۱۹۲۲ء میں جب میری زوجہ کا انتقال ہوا جس سے میں بیحد مانوس تھا تو میری حالت عجب کشمکش کی ہو گئی۔ اس قدر لوگوں کی پرورش کا بار مجھ پہ تھا کہ ترک دنیا بھی نہیں کرسکتا تھا اور شدت غم کی وجہ سے زندہ رہنا بھی دشوار تھا۔ اس وقت مرزا جعفر علی خاں اثر نے مجھے مشورہ دیا کہ غم غلط کرنے کے لئے میں شاعری کو اپنا مونسِ تنہائی بناؤں۔ اگرچہ اس سے پہلے شاعری کبھی نہیں کی تھی۔ جگر مرادآبادی میرے یہاں برسوں مہمان رہے۔ مگر میں ان کا اور دیگر شعراء کا کلام سن لیا کرتا تھا اور خود کچھ نہیں کہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء سے میں نے شاعری کو اپنا مونسِ تنہائی بنالیا"

اس طرح آپ کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ سب سے پہلی غزل جو مشاعرے میں ۱۹۲۴ء میں کانپور میں آپ نے پڑھی تھی اس کا مطلع یہ تھا۔

روحِ نسیم آئینۂ رخسار کون ہے
کھلتا نہیں کہ رونقِ گلزار کون ہے

وحشی صاحب نے شعر و شاعری میں کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا تھا۔ اپنے خود نوشت حالات میں لکھتے ہیں۔

"اگر میں کسی سے اصلاح لیتا تو ممکن ہے کہ میرا اب تک کلام کچھ ٹھکانے کا ہو جاتا

[1] یہ حالات ناظم الحروف کی فرمائش پر سپرد قلم فرمائے تھے۔

مگر میری شانِ خودداری نے مجھے اجازت نہ دی کہ میں اپنے ناچیز کلام میں کسی دوسرے کے خیالات یا الفاظ کی آمیزش کروں۔ اگر میرا کلام بے تکا ہے تو اُسے ایسا ہی رہنے دیا جائے۔"

وحشی صاحب نے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کے کلام کو یکجا کرکے "سرودِ عرفاں" کے نام سے مرتب کرلیا تھا۔ لیکن اس مجموعے کو اپنی حیات میں شائع نہ کرا سکے۔ اس مجموعہ کے علاوہ تین بیاضوں میں آپ کا کلام اور تھا اپنے خودنوشت حالات میں فرماتے ہیں۔

"میں نے سر تیج بہادر سپرو کے اصرار سے اس وقت تک کے کلام کو یکجا کرکے اس کا نام سرودِ عرفاں رکھا تھا اور اُن کے پاس بغرض تقریظ بھیج دیا تھا مگر اس دوران میں وہ سخت علیل ہو گئے اور اردو بھی کسمپرسی کی حالت میں پڑ گئی۔ اس لئے یہ مجموعہ ویسا ہی رکھا ہے"۔

وحشی صاحب نے ۴ر اگست ۱۹۶۰ء کو کانپور میں انتقال کیا۔ انھوں نے ساری زندگی اپنے خونِ جگر سے اردو کے گلستاں کو سینچا۔ لیکن افسوس ہے کہ اُن کی ادبی خدمات اور شاعری پر ابھی تک وہ توجہ نہیں دی گئی ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ وحشی صاحب کے کئی شاگرد بھی ہیں۔ اُن میں قابلِ ذکر اُن کے بھانجے سچدانند سنہا ہیں۔

وحشی کا شمار ہمارے اساتذۂ سخن میں تھا۔ غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی غزلوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کوئی شعر ایسا نہیں ملے گا جس میں عریانیت پائی جاتی ہو۔ وحشی کو تصوف سے خاص ذوق تھا۔ انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ تغزل کے رنگ میں فلسفۂ تصوف کو بیان کریں غزلوں میں شگفتگی اور روانی ہر جگہ ملے گی۔ جگر بریلوی جدید تغزل[1] میں آپ کی غزل کے سلسلے میں فرماتے ہیں

"آپ کی غزل میں غم و اندوہ کے مضامین ہونا لازمی ہیں۔ غم و اندوہ پر غالب آنے کے لئے آپ نے تصوف کا سہارا لیا۔ چنانچہ غزل میں بھی یہی رنگ ہے عامیانہ اور سوقیانہ رنگ سے آپ دور رہے ہیں۔ کلام میں رفعت و پاکیزگی ہے

[1] یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے اور اس کا قلمی نسخہ آج کل شمس بدایونی کے پاس محفوظ ہے۔

طرزِ ادا میں جوش اور آمد ہے جو تصوف کے مضامین سے مل کر کہیں کہیں مستانگی کا عالم پیدا کردیتی ہے۔ اس کے لئے فارسی الفاظ وتراکیب آپ کو بہت مدد دیتے ہیں۔ آپ کے اشعار غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ پروفیسر عبدالشکور اپنی کتاب دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعراء میں وحشی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے صفحہ ۱۰۲ پر آپ کی غزل گوئی کے سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

" وحشی ایک بلند پایہ غزل گو بھی ہیں۔ ان کی غزل میں تغزل بدرجۂ اتم موجود ہے بعض اشعار حقائق روزگار سے متعلق ہیں۔ تصوف کی ہلکی سی جھلک جگہ جگہ عیاں ہے زبان میں روانی و سلاست موجود ہے مگر فارسی ترکیبوں سے اپنے کلام میں زور پیدا کرتے ہیں۔ اُن کے کلام کے منتخب منفرد اشعار بھی اُن کے مسلم الثبوت غزل گو ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔"

وحشی کی غزلیات کا ایک انتخاب، جو خود انھیں کا کیا ہوا ہے میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ انتخاب انھوں نے جگر بریلوی کی خدمت میں اپنے کلام پر ان کی رائے حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس انتخاب میں سے کچھ اشعار پیش کرتا ہوں

اڑائے پھرتی ہے سب کو ہوا زمانے کی
خبر کسی کو نہیں اپنے آشیانے کی

اسے ذوقِ طلب سمجھوں کہ تکمیلِ جنوں سمجھوں
تری صورت کا ہر ذرہ پہ ہوتا ہے گماں مجھ کو

عشق اگر حسن کے پردے میں نہ پنہاں ہوتا
دشت تو دشت ہے گلشن بھی بیاباں ہوتا

حقیقت بیں وہی اس بحرِ ہستی کا شناور ہے
جو موجوں کا سہارا لے کے پھر موجوں سے باہر ہے

Scanned by CamScanner

زمیں سے آسماں تک آسماں سے لامکاں تک ہے
ذرا پروازِ مشتِ خاک تو دیکھو کہاں تک ہے

کس سے پوچھیں نشانِ منزل کا
راہ میں گردِ کارواں بھی نہیں

سلامِ شوق کا اپنے کہیں ملا نہ جواب
انہیں تو دیر و حرم میں بھی ہم پکار آئے

میں شریکِ بزمِ ہستی ہو گیا بدنام بھی
بزم برہم ہو گئی آیا نہ مجھ تک جام بھی

یوں ترنم ریز ہے ہر پردہ دل کے ساز کا
ہر نفس پر مجھ کو دھوکا ہے تری آواز کا

اک تجلّی ہی تجلّی ہر طرف پاتا ہوں میں
اللہ اللہ کیا اثر ہے حسن کے اعجاز کا

اللہ رے ترے رخ پہ حجاباتِ تجلّی
الجھی ہوئی اب تک انہیں پردوں میں ہے نظر

وطن کی یاد سے غربت میں سوگوار رہے
چھٹے عدم سے تو ہستی میں اشکبار رہے

دہر کے لوگ جسے بے خبری کہتے ہیں
رندِ مشرب اُسے بالغ نظری کہتے ہیں

عمرِ فانی کی جھلک عہدِ جوانی تک ہے
لوگ پیری کو چراغِ سحری کہتے ہیں

گھٹائیں اودی اودی میکدہ بردوش و فصلِ گل
نہ جانے لغزشِ توبہ سے ایمانوں پہ کیا گزری

تمنّا ہے تو جا کے پوچھو یہ صحرا نوردوں سے
کہ وحشی کے نہ رہنے سے بیابانوں پہ کیا گزری

یہ آبلے مرے دل کے فروغ پا نہ سکے
چراغِ شامِ غریباں تھے جگمگا نہ سکے

وہ کرسکیں گے بھلا کیا نظارۂ رخِ دوست
جو تابِ جلوۂ حسنِ نقاب لا نہ سکے

باخبر تجھ سے سب سے بیگانہ
کتنا عاقل ہے تیرا دیوانہ

آرہی ہے سازِ ہستی سے صدا میرے لئے
گونجتی ہے عشق کی ساری فضا میرے لئے

کس قدر ہے وسعتِ دامانِ حرماں دیکھئے
موجِ ساحل بن گئی ہے موجِ طوفاں دیکھئے

ازل سے وقف تھے جو صورت آفریں کے لئے
تڑپ رہے ہیں وہ سجدے مری جبیں کے لئے

وحشی صاحب کی نظمیں "بال بدھوا" "ہستی" "چرخہ" اور "نور جہاں" اردو ادب میں ایک یادگار کارنامہ ہیں۔ اُن کی اُن نظموں میں روانی اور شعریت پائی جاتی ہے۔ کانپور میں جب دوسری کُل ہند اردو کانفرنس ہوئی تھی جس کی صدارت سر عبداللہ ... نے فرمائی تھی تو انھوں نے اپنی شاہکار نظم "نور جہاں" پڑھی تھی۔ اس ... کے چند بند ملاحظہ فرمایئے۔

سو رہا ہے منہ چھپائے کون یہ زیرِ زمیں　　ہے صبا لرزاں کہ آجائے نہ پیشانی پہ چیں
دے رہی ہے لوریاں اس طرح بوئے یاسمیں　　جیسے ہو معروفِ خوابِ ناز کوئی نازنیں

نغمہ ریزِ عشق ہے سنسان جنگل کی ہوا!
پردہ دارِ عشق ہے تاریک راتوں کی فضا

رو رہی ہے بیکسی پر شمعِ تربت زار زار　　ہنس رہی ہے دیکھ کر یہ گردشِ لیل و نہار
آرزوئیں چھا رہی ہیں قبر پر بن کر غبار　　حسرتیں سر پیٹتی ہیں فرطِ غم سے بار بار

سونے والے خاک کے بستر پہ آنکھیں اپنی کھول
کون ہے تو اور کہاں سوتا ہے منہ سے کچھ تو بول

کتنی حسرتناک ہے دنیا میں تیری داستاں　　کتنا عبرت خیز ہے منظر ترا نورِ جہاں
بے شمار افواج تھیں جس جا پہ تیری پاسباں　　سو رہی ہے بے خبر تو آہ اب تنہا یہاں

یا کہ ویرانی صحرا پاسبانی می کند
یا کنوں شمعِ شبستاں نوحہ خوانی می کند

"یادِ شباب" کے عنوان سے ۱۹۲۹ء میں وحشی صاحب نے ایک نظم لکھی تھی اس نظم کے مطالعے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ حوادث نے نہ صرف آپ کی زندگی بلکہ آپ کے شباب کو اس قدر تلخ کر دیا تھا کہ آپ "یادِ شباب" نظم لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ دو متوق بند ملاحظہ کیجیے

آنکھوں میں پھر رہا ہے گزرا ہوا زمانہ　　عہدِ شباب کا وہ بھولا ہوا فسانہ
وہ اضطرابِ دل اور پُر شوق وہ ترانہ　　وہ سازِ مطربانہ وہ سوزِ عاشقانہ

اے کاش تیری صورت پھر اے شباب دیکھوں
پھر زندگی کا اپنے دلچسپ خواب دیکھوں

وہ اور ہوں گے جن کو تو اے شباب بھایا　　وہ اور ہوں گے جن کو جنت کے پھول لایا
وہ اور ہوں گے جن کو عیش و طرب دکھایا　　دورِ نشاط تیرا کب مجھ کو راس آیا

وقتِ اخیر اب کیا مجھ کو ستا رہا ہے
کیوں یاد آ کے ظالم مجھ کو رلا رہا ہے

وحشی صاحب نے اصغر گونڈوی، رونق اور فرقت کاکوروی کی وفات پر نوحے بھی لکھے ان کے یہ نوحے اردو شاعری میں ادبی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ جگت موہن لال رواں کی وفات پر جو نوحہ لکھا ہے

اُس کے تین بند ملاحظہ فرمایئے۔

کون یہ عالم کی نظروں سے نہاں ہو کر چلا　　توڑ کر بند عناصر شکلِ جاں ہو کر چلا
منزلِ ہستی سے گردِ کارواں ہو کر چلا　　عالمِ ارواح کو روحِ رواں ہو کر چلا

کون ہے وہ دہر سے جو صورتِ ارماں چلا
رو رہی ہے خلق اس کو اور وہ خنداں چلا

آخری جامِ مئے ہستی پئے جاتا ہے کون　　دوستوں کو داغِ مہجوری دیئے جاتا ہے کون
بزمِ اربابِ ادب سونی کئے جاتا ہے کون　　ساتھ اپنے ساغر و مینا لئے جاتا ہے کون

کون ہم سے پھر نہ ملنے کو جدا ہوتا ہے آج
کس کا ماتم ہے کہ ہر پیر و جواں روتا ہے آج

مرنے والے گر نہیں سنتا نہ سن آہ و بکا　　واسطہ اپنی محبت کا مجھے اتنا بتا
تو تو بے احباب یک لمحہ بھی رہ سکتا نہ تھا　　چھوڑ کر ہم سب کو آخر کیسے تنہا چل دیا

کیا ہوا جو دوستوں سے اس قدر بیزار ہے
دیکھنا بھی مڑ کے تجھ کو یک نظر دشوار ہے

رباعی زندگی کے پھولوں کا نچوڑ ہے اس لئے ہمارے شعراء اس وقت تک رباعیاں نہیں لکھتے تھے جب تک اُن کی کافی مشقِ سخن نہیں ہو جاتی تھی۔ اردو میں یگانہ، امجد حیدر آبادی، رواں، محروم، جگر بریلوی، فراق اور جوش کی رباعیات کے مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ وحشی نے دو سو سے زیادہ رباعیاں مختلف موضوعات پر کہی ہیں چند رباعیاں ملاحظہ فرمایئے۔

دیکھو دیکھو حیاتِ فانی دیکھو　　دریا میں حباب کی روانی دیکھو
او خوابِ زندگی کی مستی سے　　سر سے وہ گزر رہا ہے پانی دیکھو

پھول میں فضائے طور بن کر چھا جا　　رگ رگ میں صفاتِ نور بن کر چھا جا
اے ساقی بزمِ کن، میں صدقے تیرے　　آنکھوں میں مری سرور بن کر چھا جا

DONATED BY
1993

Scanned by CamScanner